شہنشاہ ایران نے بھٹو کی رہائی کے لئے کیا تجاویز پیش کی ہیں؟

اشاعت خصوصی قیمت ۷ ۱/۲ روپے

A test for Pakistan: Bhutto must not hang

THIS WEEKEND the former prime minister of Pakistan, Mr Zulfikar Ali Bhutto is appealing to his country's supreme court against the conviction and death sentence recently imposed on him for conspiracy to murder a political opponent. There appear to be excellent legal grounds for this appeal to succeed. But even if it fails, there is every reason for the country's present military government to temper its strict view of justice with the modicum of mercy involved in keeping its leading political opponent alive, though in jail. The military regime, headed by General Zia ul-Huq, has consistently stated its intention of returning Pakistan to democratic rule. But democracy is not advanced by permanently removing the one man, however overweening and vindictive he may have been in the past, who has shown himself able to command a preponderant share of the people's support. And that is especially so when, as here, the process of removal, despite its solemn legal trappings, leaves a great deal to be desired.

So far General Zia has stood firm on his statement that he cannot interfere with the court's decision. The Pakistan judiciary, he says righteously, is independent of the state. But this really will not do. There is strong prima facie evidence that throughout Mr Bhutto's six-month trial there has been a political strand to the proceedings and that his rights to a fair hearing have been severely curtailed, if not actually denied. General Zia himself has made some most unfortunate remarks, both before and during the trial, which appear to pre-empt both verdict and sentence.

Of the evidence itself, it is almost impossible for an outsider to judge—so much of the defence was taken in camera, and the immensely long judgment, on which the appeal has to be based, presents a minefield of legal intricacies. But some points—such as the exclusion of the ballistic testimony, which is one of the items raised by the Bhutto lawyers—suggest that the thread of proof, always difficult in a conspiracy charge, may be less than full strength when a man's life is at stake. The old but still excellent principle in these matters is that justice must not only be done, but be seen to be done. On that basis alone, and for the lasting good name of Pakistan, Mr Bhutto should not hang.

۲۷، مئی تا ۳ جون ۱۹۷۸ء

یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیئے۔ کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے اس کی غربت اور عالمی اقتصادی صورتحال کی وجہ سے پاکستان میں شہریوں بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے انہوں نے مزید کہا کہ عوام بے حد جذباتی ہیں اور ایک مذہبی نعرے کے ذریعے انہیں ابھارا جا سکتا ہے اور آخری اور سب سے اہم عنصر یہ کہ پاکستان میں ..... کے منہ خون لگ چکا ہے وہ پاکستان کی سیاست میں ۱۹۵۲ء سے ملوث رہے ہیں اور وہ سیاسی اعتبار سے جاہ پسند ہیں۔ مسٹر وولف نے بتایا کہ منصوبہ یہ ہے کہ احتجاج کو ہوا دینے کے لئے سیاستدانوں کو استعمال کیا جائے اور اس کے بعد ..... کو اجازت دیدی جائے کہ اقتدار پر قابض ہو جائیں۔ سی آئی اے کے نمائندے نے کہا کہ پاکستان کے سیاستدان ایک جھگڑالو مجمع ہیں، لیکن سی آئی اے جانتی ہے کہ انہیں ایک عارضی مدت کے لیے کس طرح اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ ہماری روحوں کو فولادی بنانے کی غرض سے اپنی طویل خود کلامی یہ کہکر ختم کی کہ پاکستان کا انٹیلی جنس بورڈ چوتھے درجے کا ہے اور ..... میں سی آئی اے کافی حد تک دھنسی ہوئی ہے مگر انہوں نے فوری یہ اضافہ کیا کہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں" بائی روڈ کو امریکہ کے سفیر کی حیثیت سے اپنی گھٹتی ہوئی بالادستی کو جتانا پڑا انہوں نے وولف سے بات اچکتے ہوئے کہا کہ یہ ایک گندہ کاروبار ہے لیکن ریاستہائے متحدہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر تلی ہوئی ہے اس کے بعد وہ برطانوی سفیر کی طرف پلٹے اور کہا کہ۔

"کیونکہ آپ لوگوں کو دورہ کابل کو رد کرنا ہے اور پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کو اس وقت تک جوں کا توں برقرار رکھنا ہے جب تک کہ ہم مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ نہیں دیتے اس لیے بہتر ہے کہ اب آپ اپنا کام شروع کر دیں وقت نکلا جا رہا ہے۔" برطانوی سفیر نے جواب میں کہا کہ "مسٹر موریٹیمر ڈیوڈ (؟) کو انتہائی منفرد حالات میں یہ فرض سونپا گیا ہے وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ کانفرنس کو اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں ان سے بات شروع کرنے کی درخواست کروں میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ بھٹو کو رخصت ہوتا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو گی اس نے نہ صرف پاکستان کو دولتِ مشترکہ سے نکالا بلکہ اس نے یہ جرأت بھی کی کہ مجھے لاہور میں طلب کر کے برطانیہ سے کوہ نور کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ اسے ہم نے لاہور سے "چرایا" تھا میں

امریکہ کے عالمی مفادات

امریکہ کے علاقائی مفادات

اس دن کو یا اس آدمی کی گستاخی کو کبھی نہیں بھولوں گا" "آپریشن کوکا کولا" جیسے اہم آپریشن میں ذاتی دشمنی کو داخل ہوتے دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے شریک سازشی لوگوں سے کہا کہ میں کافی "لمبے عرصے سے اس علاقے سے لاتعلق رہا ہوں لیکن سفارشات پیش کرنے میں میری رہنمائی 'تاریخی فراست' کرے گی میں نے کانفرنس سے کہا کہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہر چیز بدلتی ہے اس کے باوجود کوئی چیز تبدیل نہیں ہوتی اس روشنی میں' میں نے تبدیل نہ ہونے والے عناصر سے فائدہ اٹھانے کی تجویز پیش کی۔ یہ تبدیل نہ ہونے والے عناصر افغان مزاج کا انتہائی حد تک زود حس ہونا اور افغان حکمرانوں کا غرور ایک جانب اور دوسری جانب "دیر" کا نرم علاقہ تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میری ذرہ بھر یہ نیت نہیں ہے کہ تاریخی بیانات میں ان کا وقت ضائع کروں۔ میں نے کہا کہ کانفرنس کو یہ یاد دلا کر قصہ مختصر کروں گا کہ یہ مالاکنڈ دیر اور باجوڑ ہی تھے جہاں ۱۹۶۰ء میں زبردست گڑبڑ پھیلی تھی کہ باجوڑ کی گڑبڑ نے پاکستان اور افغانستان کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا میں کہتا گیا کہ نرم علاقے کو صرف ۱۹۶۰ء میں ہی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اگر ۱۹۶۰ء پہلا موقعہ نہیں تھا تو ضروری نہیں ہے کہ یہ آخری موقعہ ہو۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیر انتہائی پسماندہ علاقہ ہے اور یہ مشکل نہیں ہے کہ ملاؤں کو عوام کو مشتعل کرنے پر ابھارا جا سکے اس معاملے میں کوئی چیز تبدیل نہیں ہوئی ہے میں نے مزید کہا کہ اس کے علاوہ وزیر اعظم بھٹو کی دور اندیشانہ اور جرأت مندانہ اصلاحات، اگر میں انہیں ایسا کہہ سکوں' نے مراعات یافتہ لوگوں اور خاص طور پر جنگلات کے ٹھیکیداروں کو ناراض کر دیا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا کہ دیر میں

تہلکہ مچانا انتہائی ضروری ہے۔ اس تہلکے سے خون ریزی ہو گی۔ خونریزی سے افغانستان میں پریشانی پھیلے گی اور افغانوں کی زودحسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ مذاکرات کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیں گے جب تک کہ دیر میں حالات دوبارہ معمول پر نہیں آ جاتے۔ ہمیں اس گڑبڑ کو استعمال کرنا اور اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنا پڑے گا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اگر اکتوبر یا نومبر کے مذاکرات ملتوی ہو جاتے ہیں تو ہم معیارِ حرکت، آج کے رہنماؤں اور سفارت کاروں کا پسندیدہ "لفظ" کو توڑنے کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ میری یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ مغربی یورپی سفیر اس بارے میں نمایاں طور پر پرجوش تھے انہوں نے وولف میں اور دوسرے دو شرکاء سے کہا کہ لنچ کے بعد تفصیلات طے کریں اور ہمیں اپنے ساتھ لنچ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ ہم رخصت ہونے ہی والے تھے مسٹر وولف یہ کہنے کے لئے دوبارہ آ گئے کہ آئندہ تمام میٹنگیں مغربی یورپی ملک کے سفارت خانے میں ہوں گیں۔ مسٹر وولف نے زور دیا کہ منصوبے کے تمام مرحلوں کو قطعی طور پر مقامی کردار کا حامل نظر آنا چاہیئے۔ دیر سے لے کر بھٹو کے زوال تک تمام معاملے کو شروع سے آخر تک پاکستانی شو نظر آنا چاہیئے۔ اس مرحلے پر بائی روڈ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ تمام شرکاء اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں اور اپنے داؤ پیچ سے اچھی طرح واقف ہیں انہوں نے تجویز کیا کہ وقت آ گیا ہے کہ میٹنگ ختم کی جائے کیونکہ بہت باتیں ہو چکیں اور لنچ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

لنچ کے بعد مسٹر وولف اور سی آئی اے کے دو آدمی علیحدہ علیحدہ مغربی یورپ کے ملک کے سفارت خانے پہنچے۔ میں ۱۵ منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ مسٹر وولف کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچنے سے پہلے سفیر مجھ سے گرما گرم گفتگو میں مشغول رہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسٹر بھٹو نے پاکستان کی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور یہ کہ وہ ان کا (بھٹو کا) بہت احترام کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پیشرو کی بیٹی اور مسٹر بھٹو کی بیٹی ایک ہی اسکول میں تھیں اور اچھی دوست تھیں۔ یہ دلچسپ گفتگو امریکیوں کی آمد پر ختم ہو گئی۔ سفیر ہمیں کانفرنس روم میں لے گئے۔ یہ بات ظاہر تھی کہ انہوں نے انتظامات کے سلسلے میں کافی محنت کی تھی۔

جب ہم بیٹھ گئے دو لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

تو میں نے امریکیوں سے کہا کہ وہ مجھے یہ بتائیں کہ انکل سام کیوں مسٹر بھٹو کا مخالف ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں برطانیہ کی اور اپنی وجوہات سے واقف ہوں لیکن مجھے اب بھی امریکی وجوہات کا علم حاصل کرنا ہے کیونکہ میں حالیہ واقعات سے قطعی نابلد رہا ہوں۔ سب سے کم عمر سی آئی اے ایجنٹ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے میری بات تقریباً کاٹ دی اور کہا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں ہم بھٹو کے پیچھے پاگل کیوں ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مسٹر بھٹو اتنا بڑھتے جا رہے ہیں کہ اپنے جامے میں نہ سما سکیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی قیادت میں پاکستان ریاستہائے متحدہ کے عالمی اور علاقائی مقاصد میں مداخلت کر رہا ہے۔ ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔ ہمارے عالمی مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا۔

۲۔ عالمی اقتصادی ڈھانچوں کو جوں کا توں برقرار رکھنا

۳۔ اقوام متحدہ میں تیسری دنیا کی آواز کو محدود کرنا۔ اسمیں جنوبی افریقہ بھی شامل ہے۔

مسٹر بھٹو کی پالیسیاں ان عالمی مقاصد سے متصادم ہیں۔

ہمارے علاقائی مقاصد یہ ہیں!

۱۔ مسلم اتحاد کو توڑنا اور مشرق وسطیٰ پر ایک سمجھوتہ مسلط کرنا۔

۲۔ برصغیر میں ہندوستان کی بالادستی قائم کرنا۔

یہاں بھی مسٹر بھٹو کی پالیسیاں ہمارے علاقائی مقاصد سے متصادم ہیں۔

نوجوان اور تنومند امریکی نے اپنے نکات جامع طور پر پیش کئے اور یہ کہتے ہوئے بات ختم کی "اب تم سمجھے۔ میک"

قدیم مکتب سے تعلق رکھنے اور جدید دور کی کھردری اور مروج زبان سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اس تروتازہ نوجوان امریکی سے کہا "میرا نام ڈیونڈ ہے۔ سر مورٹیمر ڈیونڈ۔ میک نہیں" میں نے اسے، وولف اور تیسرے امریکی کو صاف طور پر بتلا دیا کہ میں اس طرح کی بدتمیزی کو ناپسند کرتا ہوں۔ معاملات کو درست کر کے ہم کاروبار کی طرف متوجہ ہوئے ،، وہ کاروبار، جسکا حوالہ اس صبح دوبارہ بائی روڈ نے دیا تھا۔ ہم چاروں نے ۹ دن کے اندر ایک شاہکار تیار کر لیا "تمام نٹ بولٹ کس دیئے گئے۔ ہم مطمئن تھے ابتدا سے انتہا تک۔

یوں تیرتا جائے گا جیسے راج ہنس جھیل میں تیرتا ہے وقت کی حد دس ماہ تھی۔ برطانوی دیر کی کے ہنگامے اور داؤ۔ بھٹو مذاکرات کے غیر معینہ مدت کیلئے التوا کے ذمہ دار ہوں گے اور اس طرح پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کو جوں کا توں برقرار رکھیں گے۔

امریکی پاکستان کے سیاسی میدان میں، انتخابات سے پہلے انتخابات کے دوران اور انتخابات کے بعد اور مشن کی تکمیل تک کے مراحل کے ذمہ دار ہوں گے۔ ہم نے آپریشن کو کاکولا منظوری کے لئے بذریعہ تار واشنگٹن روانہ کیا۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۷۶ کو ہمیں تیزی سے کارروائی کرنے کی منظوری ملی۔ فوراً ہر چیز کو حرکت میں لایا گیا۔ ایک وسیع پیمانے کا آپریشن شروع کیا گیا۔ کمپیوٹر اور سکے پوری طرح حرکت میں آنے لگے۔ ہم ہر جگہ دھنس گئے ہم نے پاکستان کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی ڈھانچے کے ہر شعبے میں عمل دخل حاصل کر لیا۔ ہم نے کوئی ایسی بات نہ چھوڑی جس کا بندوبست نہ کیا ہو۔ ہم نے کوئی چیز اتفاق پر نہیں چھوڑی۔ ایک تفصیلی کوڈ بنایا گیا اس کے بعد مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر "بالائی سندھ کے مال" کے طور پر کیا جاتا تھا۔ وہ واقعات جن کی منصوبہ بندی ہم نے کی تھی انہیں مجبور کرتے اور عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو حکام مجاز کو اطلاع دینی تھی کہ "پارٹی ختم ہو گئی"، دوسری صورت میں بغاوت کا اعلان کرنے کے لئے ہمیں کہنا تھا "اچھی طرح چھٹی منائیے" ہم نے بغاوت کے لئے تاریخ بھی مقرر کر دی تھی۔ یہ اس لئے ممکن تھا کہ ہم جانتے تھے وزیر اعظم پاکستان ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ۴ جولائی کو امریکہ کی آزادی کی سالگرہ کی تقریب میں امریکی سفارت خانے کے استقبالئے میں شرکت کے لئے دار الحکومت میں موجود ہوں گے ہم نے ہر چیز مکمل تیار کر لی تھی۔

کوئی منصوبہ اس کی کامیابی یا ناکامی، کامیابی یا ناکامی کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ منصوبہ توقعات سے زیادہ کامیاب رہا۔ منصوبے کے مطابق داؤد بھٹو مذاکرات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گئے۔ منصوبے کے مطابق پاکستان میں انتخابات منعقد ہوئے منصوبے کے مطابق ہم نے حکومت کی مخالف طاقتوں کو متحرک کیا اور انہیں ایک نعرہ دیا۔ ہم نے منصوبے کے مطابق انتخابات کے بعد کے احتجاج پر زور دیا اور منصوبے کے مطابق اسے خالص مقامی رنگ دیا۔ منصوبے کے

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

کچھ سچ کچھ جھوٹ

لگے ہاتھوں آج کی صحبت میں ہاتھوں کا ذکر ہو جائے بلکہ ذکر خیر ہو جائے۔ ذکر خیر اس لئے کہ کہیں رنگے ہاتھوں پکڑا نہ جاؤں حالانکہ میں رنگریز نہیں ہوں۔ میں انگریز بھی نہیں ہوں لیکن پھر بھی ڈرتا ہوں کہیں رنگے ہاتھوں نہ پکڑا جاؤں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے لئے ضروری نہیں کہ آپ خواہ مخواہ رنگریز ہوں اور دوشیزاؤں کے دوپٹوں پر پکا رنگ چڑھاتے ہوں۔ دنیا کے کتنے ایک رنگریز دوپٹوں پر پکا رنگ چڑھاتے ہیں لیکن زندگی بھر رنگے ہاتھوں پکڑے نہیں جاتے۔ رنگے ہاتھوں اکثر وہ لوگ پکڑے جاتے ہیں جو رنگریز نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ دوشیزاؤں کے دوپٹوں پر پکا رنگ چڑھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ میں چونکہ رنگریز نہیں ہوں اس لئے ڈرتا ہوں کہیں رنگے ہاتھوں پکڑا نہ جاؤں میری اُستانی محترمہ کا کہنا ہے کہ "میں اردو ادب اور صحافت میں ابھی نووارد ہوں۔ لہٰذا جو کچھ لکھوں سلیس اردو میں لکھوں۔ اردو کے محاوروں کی بیخ کنی سے اجتناب کروں اور بوقلمونی تحریر سے لازمی طور پر گریز کروں۔

جب کبھی مجھ سے املا وغیرہ کی غلطی ہو جاتی ہے۔ میری اُستانی مجھے آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔ وہ مجھے مرغا نہیں بناتیں۔ وہ مجھے بنچ پر کھڑا نہیں کرتیں، وہ میری پٹائی نہیں کرتیں۔ وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے مجھے ایک لاکھ مرتبہ بتلایا کہ جوق در جوق میں جوق استعمال ہوتا ہے وہ قلم والا ق ہے نہ کہ کتے والا ک۔ لیکن میں جب بھی جوق در جوق لکھتا تو اس طرح لکھتا کہ کتے والا ک استعمال کرتا۔ جوک در جوک، ایک روز وہ بہت جھنجھلائیں لیکن اس طرح کہ

کچھ سچ کچھ جھوٹ

امر جلیل

بہت ہی ملائمت سے بہت ہی پیار سے مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیکھو میاں جوق در جوق میں جو ق استعمال ہوتا ہے وہ قلم والا ق ہوتا ہے نہ کہ کتے والا ک۔ استانی محترمہ نے جو مجھے اس طرح آڑے ہاتھوں لیا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میرے پسینے چھوٹ گئے میں اس وقت اپنی دوست ڈمپل ڈسوزا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اسے مومن خاں مومن کا کلام سنا رہا تھا۔ میں اسے غالب کا کلام اس لئے نہیں سنا رہا تھا کہ آج کل ہر سو مومن خاں مومن کا چرچا ہے۔ جو مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ آپ نے یہ کبھی نہیں سنا ہو گا کہ غالب ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی! بہرحال اُستانی محترمہ کا حربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ ڈمپل ڈسوزا کے سامنے ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ اس روز کے بعد جب بھی جوق در جوق لکھا تو قلم والے ق سے ہی لکھا۔

ہاتھوں کے بہت سے استعمال ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اپنے ہاتھ سے اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام کر ایک عدد ڈوئیٹ گا سکتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ہاتھ آپ کو گریبان سے پکڑ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ہاتھ آپ کی محبوبہ کے ابا کا ہی ہاتھ ہو۔ وہ ہاتھ آپ کی محبوبہ کے ابا کا بھی ہو سکتا ہے اسی طرح ہاتھوں کے کئی ایک استعمال ہیں۔ آپ اگر کسی اسکول کے استاد محترم ہیں تو آپ کسی غریب کے بچے کو اپنے ہاتھ سے تڑاخ سے ایک چپت رسید کر سکتے ہیں اور کسی افسر کے بچے کو اسی ہاتھ سے پیار کر سکتے ہیں۔ آپ اگر پولیس والے ہیں تو اپنے مقدس ہاتھ سے آپ کسی سائیکل سوار کا بغیر بتی کے سفر کرنے کے جرم میں چالان کر سکتے ہیں۔ اسی ہاتھ سے آپ کسی مرسڈیز والے کو سگنل توڑ کر آگے نکلتا دیکھ کر زوردار سیلوٹ کر سکتے ہیں۔ ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں۔ ہاتھ کسی مجنوں پر سنگ اٹھاتے ہیں۔ ہاتھ بندوق تھام کر رشتۂ زندگی کو توڑ دیتے ہیں۔ ہاتھ سہارا چھین لیتے ہیں۔ ہم دوسروں کے ثمر پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

سن ۱۹۵۸ء میں جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب نے ملک کو بحران سے بچانے کے لئے اقتدار سنبھالا تھا تب انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ان سے پہلے یعنی پچھلے گیارہ برس میں پاکستان میں لوگوں کے ہاتھ دو طرح کے کام کرتے تھے۔ کچھ ہاتھ لوگوں کو لوٹ لیتے تھے اور کچھ ہاتھ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی دستاویزات تیار کرتے تھے۔ ہم نے ان کی بات مان لی۔ کچھ عرصے بعد یعنی سن ۱۹۶۹ء میں جنرل آغا محمد یحییٰ خاں صاحب نے ملک کو بحران سے بچانے کے لئے اقتدار سنبھالا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ پچھلے دور میں یعنی ایوب خاں کے دور میں کچھ ہاتھ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے دستاویزات تیار کر رہے تھے۔ ہم نے ان کی بات بھی مان لی۔ اس کے بعد سن ۱۹۷۱ء میں ملک کو بحران سے بچانے کے لئے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا۔ انہوں نے ہمیں آگاہ کیا کہ ان سے پہلے کچھ ہاتھ لوگوں کو لوٹ لیتے تھے اور کچھ ہاتھ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے دستاویزات تیار کرتے تھے۔ ہم نے ان کی بات بھی مان لی تھی۔

اس ضمن میں مزید کچھ لکھنے سے ہمارے ہمدرد دوست عبدالقدوس نے ہمیں متنبہ کیا ہے۔ اور اس نے مجھ پر سنسر کی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا مسئلہ یہ نہیں کہ وہ گنجے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ منہ دھوتے ہوتے بمشکل جان پاتے ہیں کہ ان کی پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے اور ان کا سر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ علم سیاسیات اور علم عمرانیات آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ کہ اب صرف عبدالقدوس ہی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں کہ علم سیاسیات کی سرحدیں کہاں ختم ہوتی ہیں۔ اور علم عمرانیات کی حدود کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔
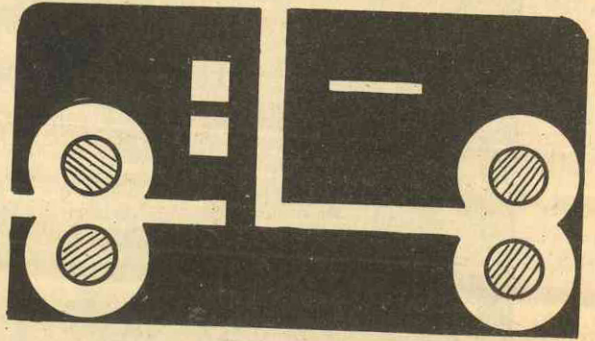
ہمارے قابل ذہین اور ضرورت سے زیادہ پڑھے لکھے سیاستدان ہمیں بہت اچھی اچھی باتیں بتاتے رہتے ہیں اور ہماری معلومات میں قابل قدر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ کون سیاستدان اصل میں کس کا بیٹا ہے۔ اور اس کا ماما کیا کرتا ہے اور اس کا خالو اس وقت کہاں ہے۔ اسی طرح وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ کون سیاست دان کس نمبر کا جوتا اور کس ناپ کا جانگیہ استعمال کرتا ہے اور یہ کہ فلاں سیاست دان کا وزن کتنا ہے اور وہ دن میں کتنے کیلو حلوہ اور کتنے پان کھاتا ہے۔ ہمیں اپنے قابل، ذہین اور ضرورت سے زیادہ پڑھے لکھے سیاستدانوں کے توسط سے ملک میں غیر ملکی ہاتھوں کی موجودگی کا پتہ چلا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ لیاقت علی خاں کے قتل سے لے کر ترنم عزیز کے اغوا اور قتل تک پاکستان میں غیر ملکی ہاتھ کام کرتے رہے ہیں۔ ایوب خاں کو غیر ملکی ہاتھ اقتدار میں لاتے تھے غیر ملکی ہاتھوں کے ہاتھوں وہ اقتدار سے محروم ہوئے! اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار میں آنے کے در پردہ غیر ملکی ہاتھ تھا۔ پچھلے دنوں گولیمار میں جو کچھ ہوا بقول ایک معتبر سیاستدان کے اس میں بھی غیر ملکی ہاتھ تھا چھانگا مانگا کے قریب جو بس کا حادثہ ہوا تھا اس میں بھی غیر ملکی ہاتھ تھا۔ فقیر محمد کالو کی سائیکل کی چوری غیر ملکی ہاتھ کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ایک سیاستدان سے جب اتنے غیر ملکی خفیہ ہاتھوں کی پاکستان میں موجودگی کے اسباب پوچھے گئے تو انہوں نے فرمایا اس کے پیچھے بھی غیر ملکی ہاتھ ہے۔

پنچ کے ذریعے ساکھ بحال کرنے کا نسخہ

—— دی اکنامسٹ ۸ اپریل ۷۸ء، نمائندہ برائے برصغیر کی رپورٹ ——

مسٹر بھٹو کو موت کی قطار میں منتقل کرنے کے بعد کے تین ہفتوں سے پاکستان میں سکون کی ایک سادہ توجیہہ یہ ہے کہ فوجی حکومت نے کوئی خطرہ مول نہ لیتے ہوئے مؤثر احتجاج کرنے والوں پر پابندی لگا کر، انہیں جیلوں میں ڈال کر، دھمکا کر اور سنسر لگا کر انہیں خاموش کر دیا ہے۔

سیاسی سرگرمیوں پر ایک ماہ کے لئے جو پابندی عائد کی گئی تھی اس میں جنرل ضیاء الحق کے اگلے اعلان تک توسیع کر دی گئی ہے۔ سرسری فوجی عدالتوں نے سرِعام کوڑے لگانے اور قید کی سخت سزائیں دی ہیں لاہور میں پہلی سرِعام پھانسی دی گئی۔ گو ان تین مجرموں کو ایک بچے کو قتل کرنے کے غیر سیاسی جرم میں پھانسی دی گئی لیکن یہ اس بات کا قائل کر دینے والا مظاہرہ تھا کہ حکومت صرف سخت باتیں ہی نہیں کر رہی ہے اس کے باوجود چند مظاہرین نے حکام کی حکم عدولی کی اور سرِعام کوڑوں کی سزا پائی۔

اخبارات اتنے ہی شدید دباؤ میں ہیں جتنے کہ خود مسٹر بھٹو کے دور میں تھے۔ اردو اخبار "مساوات" کو جو مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی شائع کرتی ہے اس بنا پر تقریباً بند کر دیا گیا ہے کہ اس نے سابق رہنما کی اپیل کا متن شائع کرنے کی کوشش کی تھی جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد عدلیہ پر جانبداری کے الزامات تھی۔ مدیر بھی اسی جیل میں ہیں جس میں مسٹر بھٹو ہیں لیکن انہیں مسٹر بھٹو کی طرح زنجیر سے چارپائی کے ساتھ باندھا نہیں جاتا۔

دفاع کے سابق سربراہ جنرل ٹکا خان بھی عدالتی سزا کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کرنے پر زیرِ حراست ہیں۔ مسٹر بھٹو کے جو تقریباً دو ہزار حامی اس وقت جیلوں میں ہیں ان میں وہ سب سے زیادہ جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہتر تعلقات کی بحالی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی جانب سے ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کی نظر بندی تھی جو ایک طرح سے خود بھی جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی تھی۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں ایک غیر حقیقت پسندانہ منطق یہ بھی پیش کی جا رہی تھی کہ یہ جنگی قیدی ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ تحویل میں ہیں۔ ہندوستان اس بات پر زور دے رہا تھا کہ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرلے۔ تب ہی جنگی قیدیوں کی واپسی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ ہندوستان اس خوش فہمی میں تھا کہ پاکستان کے لوگ جنگی قیدیوں کو اذیت میں دیکھ کر جناب بھٹو پر ان کی فوری واپسی کے لیے دباؤ ڈالیں گے اور انہیں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے بھی مجبور کریں گے لیکن اس طرز عمل سے یہ بدنیتی واضح ہو گئی کہ ہندوستان خود جنگی قیدیوں کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر بلیک میل کرنا چاہتا ہے لیکن بھٹو نے پوری قوم کے سامنے، قوم سے خطاب کے دوران اور جلسہ گاہوں میں صورتحال کی اصل حقیقت واضح کر دی لہٰذا جنگی قیدیوں کے رشتہ داروں اور دوستوں نے اس سلسلے میں ہندوستان کی ہر شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے بھٹو کی پوزیشن کو مستحکم بنایا۔

بھٹو کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان کے قریبی دوست ملکوں میں بلکہ مغربی یورپ اور امریکہ میں بھی اندرا گاندھی کے خلاف جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی اور ان کی بدنیتی پر کہ جنگی قیدیوں کو سیاسی طور پر بلیک میل کیا جائے۔ ایک زبردست مہم شروع ہو گئی۔ عالمی پریس میں جنگی قیدیوں کے مسئلے پر ہندوستان کی پوزیشن خراب ہونے لگی۔ عالمی رائے عامہ بھی دن بدن ہندوستان کے خلاف ہونے لگی۔ دنیا کی تمام عالمی تنظیموں نے اس مسئلے پر ہندوستان کے رویے کے خلاف اور جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی پر مذمت میں قرار دادیں پاس کیں۔ جس پر ہندوستان نے اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بنگلہ دیش کی مرضی کے بغیر جنگی قیدیوں کو رہا نہیں کر پاتا تھا

مسٹر ولی خان سے جو آدھے پاکستان پر اپنی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں اس مسئلے پر جب بھارتی صحافی نے یہ سوال کیا کہ آیا ہندوستان کو یکطرفہ طور پر جنگی قیدیوں کو رہا کرنا چاہیئے یا نہیں؟ تو ولی خان نے جواب دیا کہ "یہ ایک اچھا اقدام ہو گا لیکن آپ اپنے ذہن میں اپنے دفاع کو بالاتر رکھیں۔ بھٹو خواہ کچھ ہی کہے وہ اس وقت اس مسئلے پر زبردست دباؤ میں ہے۔ جنگی قیدیوں کی ایک بڑی اکثریت پنجابیوں کی ہے اور اس کی تمام اکثریت بھی پنجاب ہی میں ہے"۔

۱۹۷۳ء میں جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا تو مذاکرات میں شامل متعلقہ مسئلوں کی پوزیشن خاصی تبدیل ہو چکی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ میں اپنی کامیابی سے ہندوستان نے جو مقام پیدا کیا تھا بعد کے واقعات سے وہ صورتحال تبدیل ہو گئی تھی۔ ہندوستان کو شدید اقتصادی بحران کا سامنا تھا، سیاسی افق پر ہندوستان کی مرکزی حکومت اور بہت سے صوبوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض صوبوں میں صدارتی راج نافذ کرنا پڑا۔ بیرونی دنیا میں ہندوستان کا وقار متاثر ہو رہا تھا۔ ہندوستان نے بنگلہ دیش سے جو عہد و پیمان کیے تھے وہ بھی اس کے لیے بوجھ بنتے جا رہے تھے۔ دوسری جانب بھٹو کی پوزیشن بہت مستحکم تھی۔ ان کی حکومت نے آئین کی تشکیل میں قومی اسمبلی سے متفقہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آبادی کے مختلف طبقات کی بھرپور حمایت حاصل کرنے کے لیے اصلاحات کے پروگرام پر عملدرآمد شروع ہو چکا تھا۔ ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا جس سے پاکستان کی از سر نو انفرادیت ابھر رہی تھی۔ قومی معیشت مشکلات سے چھٹکارا حاصل کر رہی تھی۔ پاکستان کی برآمدات میں زبردست اضافہ ہو رہا تھا کہ بنگلہ دیش کی علیحدگی سے قبل مشرقی اور مغربی پاکستان کے مشترکہ طور پر اتنی برآمدات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

ہندوستان کے ساتھ مذاکرات میں، جناب بھٹو پاکستان میں ایک جمہوری حکومت کے منتخب وزیراعظم کی حیثیت سے حصہ لے رہے تھے۔ وہ مذاکرات کے لیے صرف یکساں اصولوں کی بنیاد پر تیار ہوئے تھے۔ اور اس کی انہیں یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی۔ بالآخر ایک مشکل اور کٹھن ترین مرحلے کے بعد سہ طرفہ معاہدہ طے پایا۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی فوری واپسی پر ہندوستان تیار ہو گیا۔ اس سلسلے میں باہمی رضامندی کے ذریعے تفصیلات طے کر کے معاہدہ طے پایا۔

شیخ مجیب الرحمن ۱۹۵ جنگی قیدیوں پر جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمہ چلانے کے فیصلے سے رسمی طور پر دستبردار نہیں ہوئے تھے لیکن اس سلسلے میں یہ طے پایا کہ وہ تمام جنگی قیدی فی الحال ہندوستان کی تحویل میں رہیں گے اور اس معاملے کو پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش سہ طرفہ مذاکرات کے ذریعے بعد میں حل کریں گے۔ جس کے لیے اپریل ۱۹۷۴ء کی تاریخ مقرر کی گئی تھی لیکن واقعات توقعات سے زیادہ تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں بہت سے اسلامی برادر ملکوں نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان دوستی کے لیے ثالثی کا کام کیا۔ ان کی کوششوں سے پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا اور اسے بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمن بذات خود کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے۔ بعض اخبارات کے مطابق دوست برادر اسلامی ملکوں نے انہیں مقدمہ چلانے کے مطالبہ سے دستبردار ہونے پر مجبور کر لیا تھا۔ جو بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی بحالی کے لیے ایک بنیادی اہمیت بنا ہوا تھا۔ اور بعد میں بنگلہ دیش کی حکومت نے اپنے اس فیصلے کو واضح کر دیا۔

وہ عالمی سیاست کا ایک اہم عنصر بن گئے

۱۹۷۳ء کامیابیوں کا سال تھا۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ پاکستان کی دوسرے ملکوں کے ساتھ دو طرفہ دوستانہ تعلقات پر مبنی خارجہ پالیسی کامیاب ثابت ہو رہی تھی۔ بین الاقوامی برادری میں اس کا وقار فروغ حاصل کر رہا تھا۔ لیکن بعض لوگ مستقبل میں اس کی سلامتی کو شکوک و شبہات لاحق ہوتے نظر آ رہے تھے۔ خارجی امور میں دو طرفہ تعلقات کی پالیسی سے پاکستان کے خارجی تعلقات میں نمایاں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ خاص کر، سرد جنگ کے دوران کثیر الاطراف تنظیموں میں، جسے سوویت یونین اپنے ایشیائی سلامتی کے منصوبے میں تشویش کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پاکستان کی شرکت اب خلاف مرضی بنتی جا رہی تھی۔ اس سے علیحدگی کے سلسلے میں عذر یہ تھا کہ علاقائی تعاون برائے ترقی کے معاہدے میں پاکستان ایران اور ترکی کے قریب تر ہے اور اس پورے علاقہ کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے منصوبوں میں مشترکہ حصہ دار ہیں اور سینٹو کی تنظیم میں بھی شامل ہیں جس میں اس کے محض قریبی دوست اور اتحادی سرگرم ہیں لیکن دو طرفہ پالیسی کے تحت پاکستان نے سیٹو

سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاہدہ سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا اور اس کے مفادات کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس طرح برطانوی دولت مشترکہ میں پاکستان کی یہی پوزیشن تھی۔

پاکستان کے دولت مشترکہ سے علیحدگی کے فیصلے سے برطانیہ اور دوسرے ممبر ملکوں کو شدید صدمہ پہنچا۔ لیکن پاکستان نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ اس کی رکنیت سے اسے کوئی زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ خاص کر مشرقی پاکستان کے بحران میں، جہاں دولت مشترکہ کے دوسرے ممبر ممالک پاکستان کے لیے بے سود ثابت ہوئے۔ رسمی طور پر پاکستان کے اس تنظیم سے علیحدہ ہونے کے فیصلے سے دوسرے تمام ممبر ملکوں کے ساتھ دوطرفہ دوستانہ تعلقات کے فروغ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

پاکستان کی بڑھتی ہوئی بین الاقوامی پوزیشن ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران دنیا کے سامنے مزید واضح ہوگئی۔ مغربی رائے عامہ کے بعض حلقے اور خصوصاً امریکہ میں اس پر سب سے زیادہ حیرت پائی جارہی تھی۔ امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنگر نے مشرق وسطیٰ میں قیامِ امن کے مشن سے قبل اسلام آباد کا دورہ کیا۔ جو لوگ پاکستان کو محض برصغیر کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ہنری جیسے چالاک ڈپلومیٹ کا جو مشرقِ وسطیٰ کے کسی بھی تصفیے میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ بہت ہی قریبی رابطہ تھا۔ جناب بھٹو خود بھی عالمی امور کے میدان میں ہمیشہ سے خاصے سرگرم ہیں۔ وہ ان مبصرین کو یہ یاد کراتے رہے ہیں کہ ڈاکٹر ہنری کسنگر بڑی حد تک درست تھے۔ خوش قسمتی سے پاکستان کو ہمیشہ سے اسلام کا قلب سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مشرقِ وسطیٰ سے بہت زیادہ قریبی مضبوط رشتہ تھا۔ ان کی حکومت کی پالیسی میں اس چیز کو بڑا دخل حاصل تھا۔ اس کے سربراہ مملکت کی حیثیت سے جناب بھٹو کی دلچسپی بہت زیادہ واضح تھی اسلامی سربراہی کانفرنس سے خطاب کے موقع پر جناب بھٹو نے قرآن کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "ہم نے تم کو ایک اعلیٰ قوم نامزد کیا ہے"۔ یہ صرف پاکستان کی اسلامی دنیا میں جغرافیائی اور سیاسی پوزیشن ہی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کی حکمت عملی میں مشرقِ وسطیٰ میں تیل پیدا ہونے والے ممالک بھی شامل ہیں۔ اور پاکستان ان ملکوں میں سے ایک ہے جس میں اسلامی سربراہی کانفرنس کو ایک ادارے کی شکل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے ہمیشہ فلسطینیوں کے کاز کو تقویت بخشی ہے، جو اسرائیل کی ہٹ دھرمی کا شکار ہیں کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ اپنے آپ کو عرب دنیا کے ساتھ رابطہ کرکے ان کی جدوجہد میں برابر کا شامل کرلیا۔

چنانچہ مشرق وسطیٰ کے معاملات میں خصوصی دلچسپی سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ کیونکہ ایک اسلامی طاقت کے ناطے سے وہ اس کا پابند ہے۔ اس کے ایران اور ترکی کے ساتھ بھی خصوصی تعلقات گذشتہ چند برسوں میں ایک ٹھوس شکل اختیار کر چکے ہیں اور آر سی ڈی کے تحت تینوں ملکوں کے درمیان اقتصادی، مالیاتی، ثقافتی اور دوسرے شعبوں میں تعاون کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل آر سی ڈی مشرقِ وسطیٰ کے جنوب میں ایک قابل قدر مستحکم طاقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایران، پاکستان کی بقا اور سلامتی میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ اس حصے سے خود ایران کی سلامتی کسی بھی لمحے شدید خطرات سے دوچار ہوسکتی ہے۔

گزشتہ برسوں میں مشرق وسطیٰ کے ساتھ پاکستان کے قریبی تعلقات کی کوئی واضح سمت نہیں تھی۔ بلکہ ان کی بنیاد مصنوعی بنیادوں پر تھی لیکن تعلقات جناب بھٹو کے دور میں عالمی سیاست کا ایک ضروری عنصر بن گئے۔ انہوں نے اسے وسعت اور فروغ دینے میں بہت کچھ کیا تھا۔ انہوں نے ۷۴-۱۹۷۳ء میں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے تیل پیدا کرنے والوں کو عالمی تیل کی سپلائی پر ان کی اجارہ داری کو سیاسی اقتصادی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے قابل بنا دیا جس کے نتیجے میں تمام صنعتی ممالک جن کی خوشحالی اس پر منحصر ہوتی تھی شدید مسائل سے دوچار ہوگئے۔

پاکستان کے لیے یہ بات زبردست خراج تحسین کی باعث تھی کہ اس نے ایک مختصر عرصہ میں اسلامی دنیا میں ایک بڑا مقام حاصل کرلیا۔ اور یہ کہ دوسرے مسلم ممالک پاکستان سے صلاح و مشورے کو اولیت دینے لگے۔ سعودی عرب نے ۱۹۷۴ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہونی چاہیئے۔

مبصرین سربراہی کانفرنس کی کامیابی کا اس بات سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں رباط کانفرنس سے اسے کتنی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی جس میں چار شہنشاہ، پانچ صدر مملکت، دو وزرائے اعظم اور تین وزرائے خارجہ شریک ہوئے تھے۔ اس کا اپنا مستقل سیکریٹریٹ اور باقاعدہ رابطہ مشینری بھی ہے جس کے تحت وقتاً فوقتاً وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقد ہوتی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں کراچی میں ۱۹۷۰ء میں، جدہ میں ۱۹۷۲ء میں، بن غازی میں ۱۹۷۳ء اور رباط میں ۱۹۷۷ء میں وزرائے خارجہ کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ لیکن لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس سابقہ تمام کانفرنسوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہم اور تاریخی ثابت ہوئی۔ جس میں چھ شہنشاہ بارہ صدر مملکت، چھ وزرائے اعظم اور آٹھ وزرائے خارجہ اور تنظیم آزادی فلسطین کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ مختصراً یہ کہ یہ پوری ملت اسلامیہ کی اہم شخصیتوں کا اجتماع تھا۔ اور درحقیقت اس میں مسلم دنیا کی بقا، فلسطینیوں کے حقوق، ان کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی اور بیت المقدس کی آزادی پر ٹھوس مؤقف اختیار کرنے کو اہمیت دی اس کے علاوہ اس میں عالمی اقتصادی صورتحال کا بھی جائزہ لیا گیا اور اس بات کا عہد کیا گیا کہ رکن ممالک کم ترقی یافتہ مسلم ملکوں کی غربت و جہالت کے خاتمہ میں ضروری مدد دیں۔ اس کے علاوہ ان ملکوں اور ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان تجارت کی اصلاح کو مستقل کیا جائے اور استحصال کا خاتمہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی گئی کہ ترقی پذیر ممالک کو قیمتوں میں اضافہ سے جس صورتحال کا سامنا ہے اس کا کوئی حل تلاش کیا جائے۔

پاکستان کانفرنس کا میزبان تھا۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کی زبردست کامیابی سے دوسرے اسلامی ممالک میں بلکہ بلاشبہ ساری دنیا میں اس کا وقار بڑھ گیا اور اس کو منظم کرنے کا تمام تر سہرا اس کے وزیر اعظم جناب بھٹو کی اعلیٰ صلاحیتیں تھیں۔ نئی نسل کے عالمی مدبروں میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو تسلیم کیا جانے لگا۔ غیر ملکی سربراہان مملکت نے خود یہ دیکھا کہ پاکستان جو حالیہ بحران میں اپنا سب کچھ کھو چکا تھا کتنی تیزی کے ساتھ اپنا کھویا ہوا وقار اور عظمت ازسرنو حاصل کررہا ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس کے مستقبل کی ترقی کی صلاحیتوں کے بارے میں شکوک نہیں تھا۔ خود بھٹو ایک قابل احترام مدبر کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے لگے۔

اسلامی سربراہی کانفرنس سے جو اہم واقعات وابستہ تھے وہ غیر ملکی مبصرین کے لیے خصوصی اہمیت رکھتے تھے۔ امریکہ اور برطانیہ میں یہ دیکھا جارہا تھا کہ برصغیر میں طاقت کا توازن نئی دہلی سے اسلام آباد کا رخ کررہا ہے اور اسلامی برادر ملکوں میں اس کی پوزیشن مستحکم ہوتی جارہی ہے۔ گارجین نے لکھا تھا کہ لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس، بنڈونگ کانفرنس سے بھی بڑی اور اہم میٹنگ تھی۔ جس سے ۱۹۵۵ء میں غیر وابستگی کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اخبار

نے لکھا کہ دنیا کا یہ نیا کلب تمام سابقہ بلاکوں حتیٰ کہ قدیم ترین کامن ویلتھ اور ناوابستہ ملکوں کے کلب سے بھی زیادہ امیر اور زبردست قوت رکھتا ہے۔

پاکستان میں جمہوری اداروں کی بحالی اور ایک منتخب حکومت کے قیام سے اسے قوموں کی برادری میں ایک قابلِ عزت مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس میں دوسرے ملکوں کے غلبے کے خلاف مزاحمت کرنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے ہندوستان کی توسیع پسندی کی کوششوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ خارجی سطح پر اس نے برطانیہ، امریکہ اور روس کے غلبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا قریبی دوست چین تھا۔ تمام ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات مکمل طور پر برابری کی بنیاد پر دو طرفہ تعلقات کی بنیاد پر قائم تھے۔ پاکستان بجا طور پر حقیقی آزادی کا دعویدار بن گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے زبردست داخلی مشکلات کے باوجود حاصل کیا تھا۔

جگّے کے روپ ہزار

مرکزی فلم سنسر بورڈ نے "جگا ٹیکس" نامی پنجابی فلم کی نمائش پر پابندی لگا دی ہے کیونکہ اس میں تشدد اور جرائم کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا تھا۔ ایسی فلموں پر عموماً پابندی لگتی ہی رہتی ہے مگر یہ فلمیں اپنا نام بدل کر اور اپنی شناخت میں کچھ ردّوبدل کر کے اپنے آپ کو نمائش کے قابل بنا لیا کرتی ہیں۔ پتہ نہیں وہ کون سا فلم ساز تھا جس نے پہلے پہل جرائم مارکہ پنجابی فلم بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اہلِ پنجاب محض بڑھک باز ہیں وہ اونچا سنتے اور اونچا بولتے ہیں۔ وہ قتل و غارت کے دلدادہ ہیں، وہ مسخرے ہیں، ان کا بیسویں صدی سے کوئی تعلق نہیں وہ سب ابنارمل ہیں۔ پنجابی لڑکیاں لاچے باندھ کر لانگ جمپ لگاتی ہیں۔ وہ محبت یوں کرتی ہیں جیسے جوڈو کراٹے کھیل رہی ہوں اور "سینے سے لگ جاتی ہیں مٹھاہ کر کے"۔ ایک بار میرا ایک غیر ملکی دوست جسے اردو پڑھنے کا شوق تھا ایک اخبار میں پنجابی فلموں کے اشتہارات پڑھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔ ایک تو فلموں کے نام بڑے خوفناک تھے اس پر اداکاروں کی ایسی وحشت ناک تصویریں چھپی ہوتی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابھی اخبار میں سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں گی۔ میں نے اپنے اس غیر ملکی دوست کا خوف دور کرنے کے لئے اسے دیہات لے چلنے کی دعوت دی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا "کہ میں ایسا رسک لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" پھر اس نے ایک فلمی اشتہار پر انگلی رکھ دی۔ فلم کا نام تھا۔ "قتل تے ہون گے"

تاہم "جگا ٹیکس" کی نمائش پر پابندی پر مجھے نہ جانے افسوس کیوں ہوا ہے؟ ہمارے پرانے دوست پروفیسر انور عباس نے اس کی نمائش کو روک کر بڑی زیادتی کی ہے کیونکہ پہلی بار تو ایک ایسا موقع آیا تھا کہ وہ "جگا" سامنے آتا اور ایکسپوز ہوتا جو گذشتہ تیس برس سے خواہ مخواہ ٹیکس وصول کر رہا ہے اس کے غیر مرئی ہاتھ خود بخود لوگوں کی گردنوں سے ہوتے ہوئے جیبوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف "ہزار پایہ" ہے بلکہ "ہزار دستہ" بھی ہے اسی لئے جب وہ چاہتا ہے ہاتھ دکھا دیتا ہے۔ اور تو اور وہ ٹیکس وصول کرنے کے لئے ہتھیلی پر سرسوں بھی جما تا ہے۔ "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کی بات بھی کرتا ہے۔ دستِ شفقت بھی بڑھاتا ہے۔ دست بدستہ بھی ہو جاتا ہے لیکن پھر ایسا ہاتھ دکھاتا ہے کہ دوسرے ساری عمر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ جگے کے بارے میں بہت سے لوک گیت بھی ہیں۔ ایک بولی مجھے یاد آ رہی ہے کہ

جگا جمیا تے ملن ودھائیاں
وڈے ہو کے ڈاکے ماردا

میں "جگے" کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب پاکستان بنا تھا۔ میری اُس سے پہلی ملاقات ایک مہاجر کیمپ میں ہوئی تھی جہاں اس نے پہلے تو اپنے آپ کو پناہ گزینوں کا ہمدرد ظاہر کیا اور پھر ان کے نام پر ملنے والے راشن کو بلیک میں بیچ دیا۔ اس نے کئی ایک متروکہ املاک پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ پبلک کے پرزور اصرار پر سیاست کو بھی اپنے زریں وقت سے نوازا حالانکہ اُس وقت وہ خدمتِ خلق کے لئے سمگلنگ میں مصروف تھا۔

جگے کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نقاب پوش نہ ہونے کے باوجود اسے کوئی پہچان نہیں سکتا اُسے حالات کے مطابق بہروپ بدلنے میں ملکہ حاصل ہے لیکن اسے بہروپیا کہا جائے تو وہ چراغ پا ہو جاتا ہے اب تو اُس نے کئی ایک بالکے بھی ٹرینڈ کر لئے ہیں جو اس کے لئے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کے لئے علمائے کرام کو بھی بہکا دیتا ہے اور فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں اپنا ٹیکس کیش کر لیتا ہے۔

جگا مجھے ایک بار ایک سیاسی جلسے میں ملا جہاں وہ سٹیج پر کھڑا نعرے لگا رہا تھا۔ میں نے کہا "جگے تم پاکستان کے بدترین دشمن ہو"۔ کہنے لگا "قسمے رب دی بالکل نہیں۔ مجھے پاکستان سے بڑی محبت ہے۔ مجھ سے بڑھ کر پاکستان زندہ باد کے کوئی نعرہ نہیں لگاتا اس لئے کہ یہ سرزمین میرے لئے بڑی سازگار ہے۔ مجھے جو کچھ دیا ہے اسی پاکستان نے دیا ہے۔ یار! یہاں کے لوگ بڑے معصوم ہیں خود بخود میرے جال میں آ پھنستے ہیں۔"

میں نے جیسے پہلے عرض کیا ہے کہ ٹیکس وصول کرنے کے لئے جگے کے بڑے روپ ہیں وہ دھونس اور دھاندلی سے بھی کام لیتا ہے اور پیار اور فریب سے بھی۔ وہ افواہوں کے سانپ بھی چھوڑتا ہے اور خوف اور غیر یقینی کے پٹاخے بھی۔ میں نے اسے کریڈٹ بس اور ایکسس کی گھومنے والی کرسی پر بھی بیٹھے دیکھا ہے۔ وزارت کے قلمدان میں سرخ روشنائی ڈالتے بھی دیکھا ہے اور پولیس کی وردی میں بھی کم از کم اب "جگا ٹیکس" کی نمائش پر پابندی نہیں لگنی چاہیئے۔ اس کے چہرے پر پڑا ہوا ماسک اتار دینا چاہیئے۔ کیونکہ لوگ خوف کی فضا میں سانس لے کر اور بداعتمادی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کر کر کے تھک گئے ہیں۔ خدا نہ کرے انہیں اب کوئی "غیر ملکی جگا" پھر کوئی دھوکا دے جائے۔

ہوچی منہ

سنٹو کو زیادہ خونخوار بنایا جا رہا ہے

مشہود عسلی

۱۹ مئی ہوچی منہ کا جنم دن ہے۔ ساری دنیا کے جمہوریت پسند، انسان دوست اور ترقی پسند افراد ہوچی منہ کی سالگرہ نہایت احترام سے مناتے ہیں اور اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ وہ ہوچی منہ کی راہِ عمل پر ثابت قدمی سے گامزن رہیں گے۔ ہوچی منہ حب الوطنی، سامراج دشمنی، حریت پسندی اور ترقی پسند قوتوں کے اتحاد کی بہت بڑی علامت بن چکے ہیں۔ ان کی سالگرہ کے حوالے سے یہ جائزہ لینا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کی جمہوریت پسند اور ترقی پسند قوتیں عملی اور فکری اتحاد کی جدوجہد میں کہاں تک آگے بڑھی ہیں، انہوں نے سامراجی ریشہ دوانیوں کو کہاں تک سمجھا ہے اور ان کا قلع قمع کرنے کے لئے انہیں کون سے اقدامات کرنا ہوں گے۔

ہوچی منہ کی قیادت میں ویت نام کی ورکرز پارٹی نے طویل عرصہ تک سامراج کے خلاف لڑائی لڑی اور یہ ایک ایسی جدوجہد تھی جس کی تاریخ میں شاید چند ہی مثالیں ملیں گی۔ اسے ویت نام کے محنت کشوں، انقلابی دانشوروں اور طالب علموں، کمیونسٹوں اور قوم پرستوں غرض کہ تمام محب وطنوں کی تائید و حمایت حاصل تھی، خود امریکہ کے باضمیر لوگوں نے ویت نام میں امریکی جارحیت کے خلاف زبردست احتجاجی مہم چلائی۔ اس اجتماعی جدوجہد کا نتیجہ، امریکی سامراج کی عبرتناک شکست اور ویت نامی عوام کی شاندار فتح کی صورت میں برآمد ہوا۔ آج ویت نام کے دونوں حصے متحد ہو چکے ہیں اور ویت نامی عوام ملک کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

ویت نامی عوام کی شاندار فتح کے ساری دنیا پر اثرات مرتب ہوئے۔ افرایشیائی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس میں اچنبھے کی بات نہیں کہ پیرس کے معاہدۂ امن نے جو ۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو عمل میں آیا جنوبی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مشرق ایشیا پر بھی گہرے اور مثبت اثرات مرتب کئے۔ برصغیر کے ملکوں میں ایک طرف حالات کو معمول پر لانے کا عمل شروع ہوا، دوسری طرف جمہوری قوتوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ "یاد رہے ایک لڑائی ہے سائیگون سے منگھو ہیر تلک" کی بازگشت جگہ جگہ سنائی دینے لگی۔ ۱۹۷۳ء کی عرب۔ اسرائیلی جنگ کے بعد جب تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں نے تیل کو بطور ہتھیار استعمال کیا تو ترقی پذیر ملکوں کی سامراج دشمن جدوجہد کو مزید تقویت ملی۔ ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں خام مال اور قدرتی وسائل سے متعلق مسائل پر غور و خوض کیا گیا اور تیسری دنیا کے ملکوں نے خام مال اور قدرتی وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کا برملا اظہار کر کے سرمایہ دار دنیا میں کھلبلی مچا دی۔

یہی کیا کم تھا کہ ۳۰ اپریل ۱۹۷۵ء کو یعنی محنت کشوں کے عالمی تہوار سے ایک روز قبل سائیگان کی کٹھ پتلی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بہادر ویت نامی عوام کی شاندار جدوجہد مکمل فتح سے ہمکنار ہوئی۔ یہ خبر صبح نو بج کر تیس منٹ پر بنتوئی پہنچی ٹریفک رک گیا اور ڈرائیور عالم سرخوشی میں سڑکوں پر رقص کرنے والی لڑکیوں میں شامل ہو گئے۔ فتح کا جشن منانے والے محنت کش، طالب علم، استاد اور دفتری ملازمین، دانشور اور ادیب سیلاب کی صورت میں شہر کے مرکز کی جانب رواں دواں تھے۔ سنٹرل انفارمیشن ہال پر چسپاں ایک بہت بڑے پوسٹر پر ہوچی منہ عوامی فوج کی وردی میں ملبوس لاکھوں ہم وطنوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پوسٹر پر جلی حرفوں میں یہ عبارت لکھی تھی ـــ !

"تم ہمارے ساتھ ہمیشہ مارچ کرتے ہو انکل ہو!"

اس جملے کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وہ تمام لوگ جنہوں نے زندگی سے رشتہ جوڑا ہے، ہوچی منہ کو اپنے قریب پاتے ہیں۔ ویت نام کی تاریخی فتح نے ساری دنیا میں مسرت کی لہر دوڑا دی حتیٰ کہ دشمن بھی اس کامیابی سے اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔ امریکی ہفت روزہ "ٹائم" نے سرورق پر ہوچی منہ کی تصویر شائع کی جس پر لفظ "فاتح" درج تھا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کا اعتراف

ہفت روزہ

کہکشاں کراچی

۱۳ مئی تا ۲۷ مئی ۱۹۷۸ء

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۲۱-۲۲

معیار پبلیکیشنز

"کہکشاں" ۔ نئے انتظامات کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ہم "سلطانیٔ جمہور" کے قائل ہیں۔ اسی کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہو گی کہ ہم عوام کی ترجمانی کا حق ادا کرتے رہیں۔ قانون کے تحت قائم ہونے والی حکومت کو اس پر عائد شدہ ذمہ داریاں یاد دلاتے رہیں۔ کہ یہی راستہ ملکی تعمیر کی طرف لے جاتا ہے ہمارا کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے۔ ہم غیر جانبدار ہیں۔ جانبداری ہے تو عوام کے ساتھ کہ ہمارا ایمان ہے۔ عوام کے فیصلے ہی ہمیشہ صحیح اور وطن پرستانہ ہوتے ہیں۔

یہ خصوصی اشاعت ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ساتھ تین شمارے شامل ہیں۔ جو گذشتہ تین ہفتوں میں حالات کی رفتار کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔

قارئین کرام!

اب کے ہم اپنی آواز آپ تک جس طرح پہنچا پائے ہیں، وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں، لیکن ہم ان مشکلات سے، قربانیوں سے، پریشانیوں سے ذرہ بھر بھی نہیں گھبرا رہے، کیونکہ یہ ساری قربانیاں، اس وطن کی عظمت اور سلامتی کے لئے ہیں، جس نے ہمیں سب کچھ دیا ہے ہم اس وطن کی سربلندی، آزادی خودمختاری، خوشحالی اور سلامتی کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہیں گے۔

(ادارہ)

دفتر رابطہ

معیار پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۳۱۹۵

۱۹۰-۱-سی، بلاک ۲، پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹

پبلشر مشیر الحسن نے حسین ذکریا کے زیر اہتمام، پاکستان ہیرالڈ پریس سے چھپوا کر ۱۲ اسعید منشن میکلوڈ روڈ سے شائع کیا

چیئرمین بھٹو کی رہائی کے لیے شہنشاہِ ایران کا دباؤ پاکستان پر ؟

برطانوی ہفت روزہ "گارجین" کی اشاعت ۲۲ تا ۲۸ مئی میں جوناتھن سی ایڈال "شاہ کا دباؤ پاکستان پر" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

ایران جو افغانستان میں کمیونسٹ نواز انقلاب سے حیران ہے، پاکستان پر اس امید پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہاں کی فوجی حکومت، مشرق وسطیٰ کے تیل کے راستوں پر کریملین کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کرنے میں اس کا ساتھ دے گی۔ باخبر ذرائع کے مطابق شاہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مزید اقتصادی امداد۔ جو عام طور پر سالانہ ۲۰ کروڑ سے ۳۰ کروڑ ڈالر تک ہوا کرتی ہے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی جاں بخشی پر منحصر ہے۔

اگر جنرل ضیاء کی فوجی حکومت بھٹو کی سزائے موت پر عمل کرتی ہے تو ان ذرائع کے اشارے کے مطابق پاکستان عدم سیاسی استحکام کے قریب ہو جائے گا۔ یہ اندیشے اس علم کی بنا پر اور بھی بڑھ جاتے ہیں کہ پاکستان کے اندر تاریخی طور پر قابو سے باہر بلوچی اور پشتو قبائل اس سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ مرکزی حکومت سیاسی و اقتصادی مسائل کے شدید کرب میں مبتلا ہے۔

حال ہی میں ناراض پاکستانی لیڈروں نے جو افغانستان کا دورہ کیا اس سے بھی ایران کا یہ شبہ کم نہیں ہوا ہے کہ کابل کی نئی حکومت دونوں ملکوں میں بسنے والے قبائلیوں کے لئے روایتی افغان حمایت کے لئے آگے بڑھنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔

سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ ایران افغانستان کی جانب سے اس قسم کی مشکلات پیدا کرنے کو روکنے کے لئے "ہر ذریعہ" استعمال کرنے کے لئے تیار رہے، وہ شاہ کے بہت عرصہ پہلے کے اس انتباہ کی یاد دلاتے ہیں کہ وہ پاکستان کی مزید شکست و ریخت برداشت نہیں کریں گے۔ صحیح معنوں میں فوجی طاقت کا حوالہ دیئے بغیر یہ ذرائع اس کلیدی کردار کا ذکر کرتے ہیں جو ایرانی افواج نے عمان میں کمیونسٹ نواز ذوفر بغاوت فرو کرنے میں ادا کیا تھا۔

افغانستان کا فوجی انقلاب اور پاکستان میں ممکنہ خلفشار، شاہ کے لئے اس منظر میں کہ ایران سوویت یونین سے گھرا ہوا ہے، ایک ڈراؤنا خواب بن گیا ہے پہلے مرحلے میں عراق زبردست روسی اثرات سے ملوث ہوا۔ یہ ایران کا مغربی ہمسایہ اور رقیب ہے لیکن افغانستان اور پاکستان کے برخلاف اس کی سرحدیں روس سے نہیں ملتیں۔

اور اب روایتی بفر اسٹیٹ افغانستان میں ماسکو نواز رجحان، ان ذرائع کے بقول اس دیرینہ روسی خواب کی مزید تکمیل ہے جو زار کے زمانے سے ہی دیکھا جا رہا ہے تاکہ بحر ہند کے گرم پانی والی بندرگاہوں تک رسائی ہو سکے۔

۵۵

سپریم کورٹ میں
بھٹو کی اپیل

الزامات خود مقدمہ کو باطل ٹھہراتے ہیں

پاکستان سپریم کورٹ میں
حداختیارات سماعت مرافعۂ فوجداری
فوجداری اپیل ۱۱ ۱۹۷۸ء
ذوالفقار علی بھٹو ولد سر شاہ نواز بھٹو
کوٹ لکھپت جیل۔
لاہور........ اپیل کنندہ
بنام
مملکت........ مدعا علیہ

اپیل کنندہ ذوالفقار علی بھٹو
بصد احترام عرض گذار ہے ۔

(۱)، مذکورہ بالا اپیل مؤرخہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء ان کی جانب سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو داخل کی گئی۔

(۲)، کہ مذکورہ اپیل کی یادداشت کے پیراگراف ۲۳ میں یہ گذارش کی گئی تھی کہ سزائے موت سے بچنے کے لئے سات دن کے اندر اپیل داخل کرنے سے متعلق ہائی کورٹ کی غیر قانونی ہدایت کی تعمیل سے مجبور ہو کر اس مرحلے پر متعینہ مدت کے اختتام سے پہلے ہی درج ذیل عام بنیادی اسباب پیش کیے جاتے ہیں ۔

(۳)، کہ جب یہ اپیل یکم اپریل ۱۹۷۸ء کو سماعت کے لئے پیش ہوئی تو اس معزز عدالت نے ازراہ کرم اپیل کنندہ کے اس ادعا کو تسلیم کیا کہ ہائی کورٹ نے جو سات دن کے اندر اپیل داخل کرنے کو کہا ہے وہ غیر قانونی ہے

(۴)، کہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۸ء کو ازراہ کرم مزید ہدایت دی کہ اپیل کنندہ اپیل کی سماعت شروع

ہونے سے اپیل کے مزید اسباب پیش کر سکتا ہے۔

(۵)۔ کہ اسی لئے درج ذیل اسباب پیش کئے جاتے ہیں۔ اپیل کنندے کی یادداشت مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء میں ان کا اضافہ کر لیا جائے اور انہیں کے ساتھ پڑھا جائے۔

اضافی اسباب

(۱) کہ ہائی کورٹ نے اپیل کنندے کے خلاف جو الزام عائد کیا وہ نہ تو قانونی تھا نہ ہی مناسب عائد کردہ الزام گمراہ کن، متعصبانہ اور الجھن کا نتیجہ تھا کہ سارا مقدمہ باطل ٹھہرتا ہے۔

(۲) کہ اس الزام نے اس کیس کا مناسب اور معقول نوٹس نہیں دیا جس کا کہ اپیل کنندہ کو سامنا کرنا تھا۔

(۳) کہ اس الزام میں ایک جرم تعزیرات پاکستان کی دفعہ نمبر ۳۰۱ کے تحت آتا ہے جس کا اطلاق اپیل کنندے پر نہیں ہو سکتا۔

(۴) کہ اپیل کنندے کو زیر دفعہ نمبر ۳۰۲ بامطالعہ دفعات نمبر ۳۰۱ اور نمبر ۱۱۱ تعزیرات پاکستان مجرم قرار دے کر سزائے موت سنائی گئی ہے لیکن اس پر زیر دفعہ ۳۰۲ بامطالعہ دفعہ ۱۱۱ تعزیرات پاکستان کے تحت کسی جرم کا الزام عائد نہیں کیا گیا ہے۔

(۵) کہ الزام میں ملزم غلام مصطفیٰ کا ذکر نہیں ہے اور مبینہ سازش کے عملدرآمد میں اس کے کردار یا احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کے لئے اپیل کنندے کے مبینہ حکم کی بجا آوری کے سلسلے میں کوئی نوٹس نہیں [illegible] کے مطابق اس نے مبینہ طور اس سازش [illegible] ئے کار لائے [illegible] میں اس [illegible] کردار ادا کیا تھا۔ اس سے نہ صرف اپیل کنندہ الجھن میں پڑ گیا ہے اور اس کا مقدمہ عصبیت کا شکار ہو گیا ہے بلکہ قطعی طور پر یہ مقدمہ ہی باطل ٹھہرتا ہے۔

(۶) کہ یہ الزام متضاد اور گمراہ کن ہے۔ یہ کہتا ہے کہ "فائرنگ کے نتیجے میں نواب زادہ محمد احمد خاں کا قتل ہوا ...... اور تمہاری امداد و اعانت کے نتیجے میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲/۳۰۱ کے تحت ایک جرم سرزد ہوا اور اس طرح تم ایک ایسا جرم کیا جو زیر دفعہ ۳۰۲ بامطالعہ دفعات ۱۰۹ اور ۳۰۱ تعزیرات پاکستان ایک قابل سزا جرم ہے"۔

(۷) کہ اپیل کنندے کے خلاف ایسا کوئی الزام نہیں کہ اس نے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے ساتھ ایسی کوئی سازش کی ہو جو نواب زادہ محمد احمد خاں کے قتل پر منتج ہوئی ہو۔ مبینہ سازش کا الزام احمد رضا قصوری کے قتل سے متعلق ہے۔ لہٰذا نواب زادہ محمد احمد خاں کے قتل کے جرم میں اپیل کنندے پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی "امداد و اعانت" کے نتیجے میں یہ قتل ہوا۔

(۸) کہ الزام کی پہلی توجیہہ بھی غیر قانونی اور متعصبانہ تھی۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اپیل کنندے نے "وسط ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی کے اس وقت کے ایک ممبر احمد رضا قصوری کو وفاقی سیکورٹی فورس کی ایجنسی کے ذریعہ قتل کرانے کے لئے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے ساتھ سازش کی تھی" تو یہ الزام بارہ ہزار سے زائد ارکان پر مشتمل ایک بڑی فورس کو اس سازش میں ملوث کر دیتا ہے جبکہ ریکارڈ پر لائی گئی شہادت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس فورس کے چار یا پانچ ممبروں نے میاں محمد عباس کے زیر ہدایت، مبینہ سازش کا مقصد پورا کرنے کی کوشش کی جس میں ناکام رہے۔ اس طرح یہ فورس قطعی طور پر اس میں ملوث نہیں ہوتی، تاہم الزام کے نوٹس میں پوری ایف ایس ایف کو ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ کیس باطل ہو جاتا ہے۔

(۹) کہ بنا بریں اس دعوے کی پہلی توجیہہ اس لئے بھی انتہائی گمراہ کن ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ اپیل کنندے نے [illegible] ۱۹۷۴ء میں اس وقت وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے ساتھ احمد رضا قصوری کے قتل کی سازش کی تھی"۔ جو شہادت ریکارڈ پر لائی گئی ہے یہ اس سے متصادم ہے، یہ اپیل کنندے کے لئے حیران کن ہے کیونکہ گواہ استغاثے کے مطابق مبینہ سازش اپیل کنندے اور مسعود محمود کے پیش رو حق نواز ٹوانہ مرحوم کے درمیان وسط ۱۹۷۴ء سے بہت پہلے ہی تیار کی گئی تھی۔ عائد شدہ الزامات کے پیش نظر یہ شہادت ناقابل تسلیم تھی اور اسے تسلیم کر کے مقدمے کو باطل کر دیا گیا۔

(۱۰) اس طرح الزام کی دوسری توجیہہ کہ مذکورہ بالا مجرمانہ سازش کے مطابق اور آپ کے اشارے پر وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی جانب سے شریک ملزم میاں محمد عباس کو دی گئی ہدایات کے مطابق وعدہ معاف گواہ غلام حسین نے خود کار ہتھیاروں کے ذریعہ ایک حملے کا اہتمام کیا ...... "یہ بھی ریکارڈ پر لائی گئی شہادت سے متصادم ہے بہرحال پیش کردہ شہادت یہ بھی کہ مسعود محمود کے پیش رو، میاں عباس کو ایسی ہدایات پہلے ہی دے چکے ہیں اور مسعود محمود سے کہا گیا تھا کہ وہ اسے یہ ہدایات یاد دلا دے۔ یہ شہادت بھی ناقابل تسلیم ہے اور اس طرح یہ الزام انتہائی گمراہ کن اور متعصبانہ تھا اور یہ مقدمہ باطل ٹھہرتا ہے۔

۱۱۔ کہ زیر دفعہ نمبر ۱۲۰-بی تعزیرات پاکستان بامطالعہ دفعہ نمبر ۱۱۵ تعزیرات پاکستان کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا لیکن اپیل کنندے کو غیر قانونی طور پر تعزیرات پاکستان کی ان دفعات کے تحت ایک جرم کا مرتکب اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ نواب زادہ محمد احمد خان کے قتل کے بعد بھی سازش چلتی رہی ان الزامات کے ثبوت کے لئے اپیل کنندے کو کوئی نوٹس نہیں دیا گیا

(۱۲) کہ الزام کی تیسری توجیہہ بھی وہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو اوپر الزام کی پہلی اور دوسری توجیہات کے سلسلے میں اٹھائے جا چکے ہیں۔

۱۳۔ کہ سماعت کرنے والی بنچ کا یہ کہنا غلط ہے کہ تمام جرائم جن کا الزام ملزم پر عائد کیا گیا ہے پوری طرح ثابت ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہوا ہے جو شہادت پیش کی گئی وہ عائد کردہ الزامات سے مختلف کہانی ظاہر کرتی ہے اور وہ قابل تسلیم نہیں ہے اور عدالت کو اس پر دھیان نہیں دینا چاہیے تھا۔

۱۴۔ کہ سماعت کرنے والی بنچ نے یہ کہہ کر غلطی کی ہے کہ احمد رضا قصوری کے قتل کی سازش نواب محمد احمد خان کی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہی چونکہ احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ سازش کی سزا کا کیس دفعہ

۱۲۰-بی بامطالعہ حصّہ اوّل دفعہ نمبر ۱۱۵ تعزیرات پاکستان کے تابع ہے" - اس بارے میں یہ گزارش کی جاتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس جرم کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اسے ثابت کرنے کے لئے کوئی شہادت بھی موجود نہیں تھی اس لئے اپیل کنندے کو ان الزامات کا مجرم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایک طرف تو اپیل کنندے کو اس بناء پر مجرم قرار دیا گیا ہے کہ سازش ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے بعد بھی جاری رہی۔ دوسری طرف سماعت کرنے والی بنچ خود ہی اس کے پہلے پیرا نمبر ۵۲۳ میں کہہ چکی ہے کہ سازش ناکام ہونے کے بعد احمد رضا خان قصوری کو پیپلز پارٹی کے حلقے میں لانے کی کوششیں کی گئیں اس سلسلے میں گزارش کی جاتی ہے کہ سازش کو بیک وقت ناکام اور جاری دونوں نہیں کہہ سکتے لہٰذا یہ فیصلہ اپنی تردید آپ کرتا ہے سازش کا جاری رہنا ریکارڈ پر لائی گئی شہادت کے خلاف ہے۔

۱۵- کہ سماعت کرنے والی بنچ نے اپیل کنندے کو زیر دفعہ قسم ۱۲۰ بی نمبر ۲ ۳۰۲ بامطالعہ دفعہ نمبر ۳۰۱ ضابطہ تعزیرات پاکستان اور دفعہ نمبر ۱۰۹ اور نمبر ۱۱۱ ضابطہ تعزیرات پاکستان مجرم قرار دے کر بھی غلطی کی ہے۔ سماعت کرنے والی بنچ اپیل کنندے کو ان جرائم کے لئے قانوناً مجرم قرار نہیں دے سکتی۔ خاص طور پر دفعہ نمبر ۳۰۱ بامطالعہ دفعہ نمبر ۱۱۱ ضابطہ تعزیرات پاکستان کے تحت جرائم کا مجرم قرار نہیں دے سکتی۔

۱۶- کہ اسی طرح اپیل کنندے کے زیر دفعہ ۳۰۷ بامطالعہ دفعہ ۱۰۵ ضابطہ تعزیرات پاکستان مجرم نہیں قرار دیا [illegible] ہے۔

۱۷- کہ جرمانہ عائد کرنا بھی غیر قانونی ہے۔

۱۸- کہ نتیجتہً تمام سزائیں غیر قانونی اور ناقص ہیں اور منسوخ کئے جانے کی مستحق ہیں۔

۱۹- کہ سماعت کرنے والی بنچ کی یہ دریافت کہ اپیل کنندے پر جن جرائم کے الزامات عائد کئے گئے ہیں وہ یقینی طور پر ثابت ہو چکے ہیں۔ غلط اور گمراہ کن ہے استغاثہ ان الزامات کو ثابت کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ استغاثہ نے جو گواہیاں پیش کی ہیں

استغاثہ کی جانب سے گواہیاں قطعی ناقابلِ اعتبار ہیں

وہ متناقض اور قطعی ناقابل اعتبار ہیں اور خود استغاثہ کے گواہوں کے ذریعہ ہی یہ مقدمہ اور اس کا ایک ایک نکتہ زائل ہو چکا ہے۔

استغاثہ کی طرف سے اصل واقعہ دو تین طرح سے بیان کیا گیا ہے جو ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں

(۲) سازش سے متعلق بھی استغاثہ کا مقدمہ ناکام ہو چکا ہے مبینہ سازشیوں کے درمیان رائے کی یکسانیت یا مفاہمت نہ ہونے کے باعث یا کسی اور طرح سازش کا ہونا از روئے قانون ثابت نہیں کیا جا سکا ہے سازش سے متعلق بھی استغاثہ کے بیانات باہمی متصادم اور متناقض ہیں

(۳) استغاثہ وقتاً فوقتاً اپنی بنیاد تبدیل کرتا رہا ہے اور تفتیش نیز مقدمے کے دوران مقدمے کے مادّی پہلوؤں سے متعلق مختلف نظریات اختیار کرتا رہا ہے مثال کے طور پر گولہ بارود کے ماہر نے جب اپنی رپورٹ کے ذریعہ یہ کہہ کر استغاثہ کے کیس کو منہدم کر دیا کہ جن بندوقوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مبینہ طور پر اس جرم کے ارتکاب میں استعمال کی گئی تھیں وہ فی الحقیقت اس میں استعمال نہیں کی گئی تھیں تو ارتکاب جرم کے خولوں کی تبدیلی کا نظریہ اختراع کیا گیا۔ استغاثہ کے گواہوں نے اپنی شہادتیں قلمبند کرانے کے دوران اپنی شہادت کی ٹھوس تفصیلات میں تبدیلیاں کیں اور اپیل کنندہ کے جس کی اطلاع ان کے سابقہ بیانات سے ملی تھی انہوں نے اس کے برعکس ایک اور ہی مقدمہ تیار کر دیا۔

(۴) استغاثہ کے گواہوں نے اپنی شہادتوں میں جو اصلاحات کیں وہ اتنی بنیادی اور اہم تھیں۔ کہ کوئی بھی عدالت ان شہادتوں کو قابل اعتماد مان کر کسی شخص کو بھی کسی جرم کے لئے سزا نہیں دے سکتی تھی۔ چہ جائیکہ ایسے جرم کے لئے جس کی سزا جسمانی ہو۔

(۵) استغاثہ نے ٹھوس شاہدوں اور شہادتوں کو روک لیا اور کچھ ایسے گواہ پیش کر دیئے جس کے نام ۱۱ ستمبر ۱۹۷۷ء کے چالان میں قطعی درج نہیں تھے۔

(۶) استغاثہ کے پیش کردہ تمام گواہ صرف ایک مستغیث (گواہ استغاثہ نمبر ۱) کے سوا سرکاری ملازمین یا سبکدوش سرکاری ملازمین تھے۔ جن میں سے بیشتر نظربندیا دباؤ کے شکار رہ چکے تھے۔

(۷) تقریباً تمام گواہوں کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت بیان قلمبند کرا کر اس طرح بند کر لیا جاتا کہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل [illegible] کے عہدے پر فائز افسر پر بھی یہ اعتماد نہیں کیا جاتا کہ [illegible] مجسٹریٹ کے سامنے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت اپنا بیان قلمبند کرائے بغیر شہادت دے سکے۔ اس کے باوجود مذکورہ افسر کو دوسرے گواہوں کی طرح مجبور کیا جاتا کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت اس نے جو گواہی دی ہے اس میں ضروری اصلاحات کرے تاکہ استغاثہ کے کیس میں کئے جانے والے ردوبدل سے مطابقت ہو سکے۔

۸- گواہ اپنے بیانات میں جو اہم اصلاحات کرتے

ان کی توضیح کرنے کے لئے یہ کہنا سکھایا جاتا کہ جب ان کے بیانات کے اندر ٹھوس فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ کہہ دیں کہ ہمیں یاد نہیں یہ سابقہ بیانات عام طور پر ان کے عدالت میں حاضر ہونے سے محض مہینہ دو مہینہ پہلے ئے جاتے پھر بھی عدالت اُن کی اس نام نہاد توضیح کو جائز قرار دے دیتی۔ جب کہ اسی گواہ کے متعلق یہ حقیقت تسلیم کی جاتی کہ اس نے تین سال پہلے جو کچھ دیکھا یا سنا تھا۔ اس کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی۔

(۹) واحد گواہ جسے غیر جانبدار کہا جاسکتا تھا پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر محمد حنیف رامے تھے ان کے متعلق استغاثہ نے صفائی کو بتایا تھا کہ انہیں پیش کیا جائے گا۔ لیکن آخری لمحات میں انہیں یہ جھوٹا عذر تراش کر ترک کر دیا گیا کہ انہیں رام کر لیا گیا ہے۔ دوسرے غیر جانبدار گواہوں کو جن کے نام فہرست میں موجود تھے سرے سے پیش ہی نہیں کیا گیا۔

(۱۰) کہ استغاثہ کے تمام گواہ اپنی شہادت کے مطابق شر کا جرم کے درجے میں آجاتے ہیں۔ جن کی شہادت مزید تائیدی شہادت کے بغیر قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی نہ ہی ایسی کوئی فاسد شہادت کسی ایسی ہی دوسری شہادت کی مزید تائید کے طور پر قبول کی جاسکتی تھی۔

(۱۱) کہ مارشل لاء کی حکومت نے سرکاری ذرائع ابلاغ اور اخبارات کے ذریعہ جو معاندانہ ماحول پیدا کر دیا تھا اس سے خائف ہو کر ناروا تر غیب پا کر یا کسی اور طرح بدعنوانیوں میں مبتلا ہو کر ماتحت یا اعلیٰ سرکاری حکام جھوٹی گواہی دینے پر مجبور تھے تاکہ اپیل کنندے کو ختم کرنے سے متعلق مارشل لاء حکومت کا مقصد پورا ہوسکے۔ ان میں سے بعض گواہوں سے یہاں تک کہلوایا گیا کہ مارشل لاء نافذ ہونے سے پہلے وہ سچی شہادت دینے کے لئے آزاد نہیں تھے۔ اس جبر اور دباؤ کی فضا میں اپنی تحقیر آپ کرنے والے ان گواہوں کے متعلق یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سچ بولیں گے۔

(۲۰) اول۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین کی صدارت میں مقدمہ کی سماعت کرنے والی بنچ نے جو اپیل کنندے کے خلاف رحجان و تعصب سے متاثر تھی۔ ایک انتہائی جانبدار مستغیث کے فرائض انجام دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جو شہادت اپیل کنندے کے لئے قابل قبول اور اس کے حق میں تھی اسے غیر قانونی اور جابرانہ طریقے سے روک دیا گیا اور جو شہادت ناقابل قبول لیکن اپیل کنندے کے حق میں مضرت رساں تھی اسے وکیل صفائی کے اعتراض کے باوجود ریکارڈ پر لایا گیا۔

(دوم) کہ شہادت کے ریکارڈ کو کھلی عدالت میں اس طرح نک سکھ سے درست کیا گیا اور جوڑ پہ جوڑ بٹھا کر تیار کیا گیا کہ استغاثہ کے کیس کے حسب حال ہو جائے۔ سماعت کرنے والی بنچ کے تبصرات نے گواہوں کے ذہن میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہنے دیا کہ کس قسم کی شہادتوں کو ریکارڈ میں لانے کی ضرورت ہے۔

(سوم)۔ جملہ ہائے معترضہ جن سے استغاثہ کی مہم میں اعانت ہوتی ہے ریکارڈ کی صورت سے نمایاں ہیں۔

(چہارم)۔ گواہوں کے سابقہ بیانات اور شہادتوں کے درمیان صفائی کی جانب سے جو تضادات اجاگر کئے گئے انہیں ریکارڈ میں نہیں لایا گیا۔

(پنجم)۔ گواہان استغاثہ کی سچائی کو پرکھنے یا ان کی ساکھ کو متزلزل کرنے والے سوالات کرنے یا ریکارڈ میں لانے کی اجازت نہیں دی گئی یا اگر ریکارڈ میں لایا بھی گیا تو انہیں مسترد کر دیا گیا اور ایسے سوالوں کے جوابات ریکارڈ پر لانے کی اجازت نہیں دی گئی

(ششم) ٹھوس تضادات کی حد تک فروگذاشت سے متعلق گواہوں سے کچھ پوچھنے کی اجازت اس بنا پر نہیں دی گئی کہ ایسے سوالات کہ آیا یہ فروگذاشت تضاد کی حد تک ہے یا نہیں آخری دلائل کے مرحلے پر طے کئے جائیں گے۔ آخری دلائل کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے (پیرا ۳۸۰) میں لکھا ہے کہ بعض فروگذاشت کا تضادات کی حد تک ہونا ممکن ہے لیکن سماعت کرنے والی بنچ کی اس رولنگ کا اس کے فیصلہ سنا دینے کے بعد کسی ملزم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، بہر حال موجودہ کیس میں ایسی ایک بھی فروگذاشت نہیں جس کے متعلق سمجھا جائے کہ اس میں عدم مطابقت یا تضاد بیانی کا زور ہے جس سے استغاثہ کے کسی گواہ کی ساکھ پر اعتراض کیا جاسکے۔

(۲۱) (الف)، کہ جب کسی گواہ کی توجہ اس کے سابقہ بیان کی کسی ٹھوس فروگذاشت کی طرف مبذول کرائی گئی اور اس نے کہہ دیا کہ مجھے یاد نہیں تو اس کے ایسا کہنے کو سماعت کرنے والی بنچ نے ایک جائز توضیح تسلیم کیا۔ استغاثہ کا یہی طرز عمل رہا ہے، اس نے تقریباً تمام اہم گواہوں کو یہ سکھا دیا تھا کہ تضادات کو کیس کے ریکارڈ پر لانے سے بچنے کے لئے یہی جواب دیا کریں۔ سماعت کرنے والی بنچ، مقدمے کے ابتدائی مراحل میں یہ رائے ظاہر کر چکی تھی کہ جب کوئی گواہ یہ کہے کہ اسے یاد نہیں کہ آیا اس نے اپنے سابقہ بیان میں کوئی خاص بات کہی تھی یا نہیں تو اسے اپنے سابقہ بیان کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا اور نہ اس کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے اس کا سابقہ بیان اسکے سامنے لایا جائے گا کیونکہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ سماعت کرنے والی بنچ نے مزید کہا کہ صرف اس وقت جبکہ کوئی گواہ اپنے سابقہ بیان میں کہہ چکا ہو کہ اسے کوئی خاص حقیقت یاد ہے لیکن گواہ کے کٹہرے میں آ کر کہہ دے کہ اسے یاد نہیں تو اسے تضاد کہا جائے گا۔ اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔

(ب) گواہان استغاثہ کے سابقہ بیانات میں جو انہوں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کے سامنے ریکارڈ کرائے ہیں متعدد ٹھوس فروگذاشت موجود ہیں۔ جب ان میں سے چند فروگذاشت کی طرف سامع بنچ کی توجہ مبذول کرائی گئی تو یہ فیصلہ دیا گیا کہ چونکہ گواہ جواب میں یہ کہہ چکے ہیں کہ آیا انہوں نے اپنے سابقہ بیان میں ایسا کہا تھا یا نہیں، یاد نہیں اس لئے اس میں کوئی تضاد نہیں۔

(ج) سامع بنچ نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی گواہ اپنے سابقہ بیان کی کسی ٹھوس فروگذاشت کی تشریح یہ کہتے ہوئے کر دیتا ہے کہ اس کی شہادت میں کی جانے والی یہ اصلاح مستغیث کی جانب

باقی صفحہ ۸۰ پر

صحافیوں
کیلئے قید بامشقت
کے بعد
کوڑے بھی
راولپنڈی
جیل میں
چیئرمین بھٹو کے لئے
خصوصی انتظامات

جاوید اقبال کا صفحہ
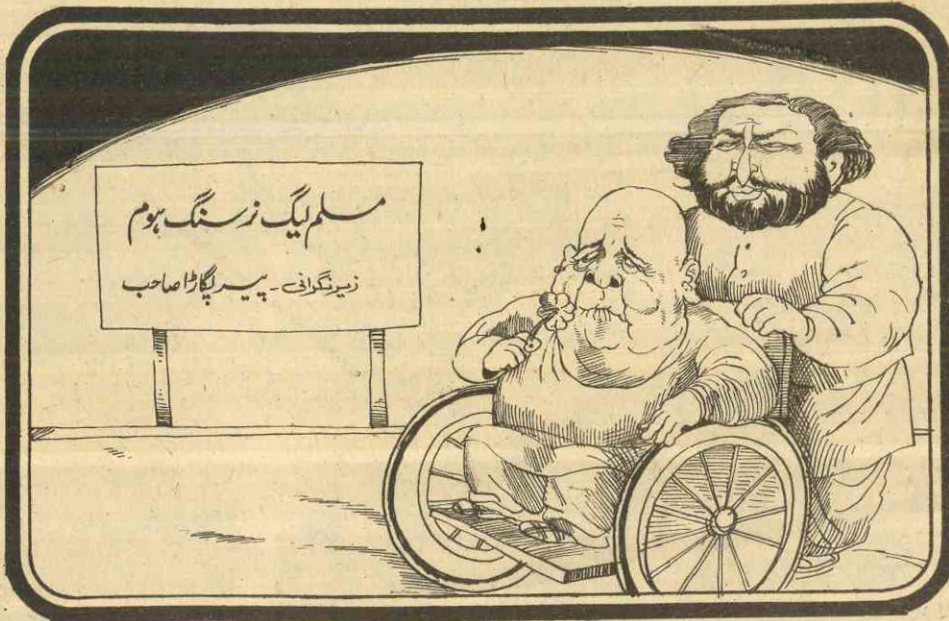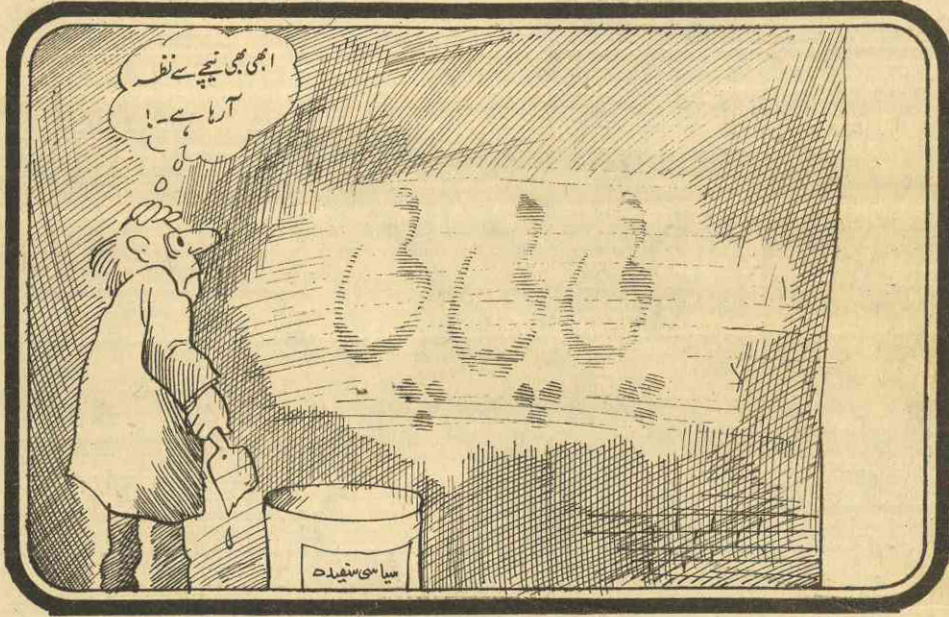
"اتحاد!"

۲۰ - ۲۶ مئی ۱۹۷۸ء

پبلیکیشنز

چیف ایڈیٹر

محمود شام

ایگزیکٹو ایڈیٹر

اشرف شاد

شعبہ ادارت

عالمی امور — رفیع احمد فدائی

ملکی امور — مجاھد بریلوی

شہناز احمد

نمائندے

حیدر آباد — حسن کامران

اسلام آباد — ضمیر نفیس

لاہور — خیکاف

پشاور — ثناء اللہ

مظفر آباد — جی ایم مفتی

ملتان — قسور سعید مرزا

فیصل آباد — خالد عباس سیف

کوئٹہ — چشتی مجاھد

خط و کتابت کے وقت لفافے پر متعلقہ شعبے کا نام ضرور درج کیجئے

پاکستان میں بذریعہ معمولی ڈاک

قیمت فی کاپی ——— ۳ روپے

سالانہ	۵۲ شمارے	۱۴۰ روپے
ششماھی	۲۶ شمارے	۷۵ روپے

بذریعہ ہوائی ڈاک

انگلستان، ڈنمارک، ناروے، فرانس، مغربی جرمنی، سویڈن، اٹلی، سوئزرلینڈ، اسپین (یورپ) اور ایشیا میں:- جاپان، ملائیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، چین،

سالانہ	۵۲ شمارے	۳۸۰ روپے
ششماھی	۲۶ شمارے	۱۹۵ روپے

ایران، عراق، سعودی عرب، کویت، سری لنکا، نیپال،

سالانہ	۵۲ شمارے	۲۳۵ روپے
ششماھی	۲۶ شمارے	۱۲۳ روپے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا،

سالانہ	۵۲ شمارے	۶۱۵ روپے
ششماھی	۲۶ شمارے	۳۱۵ روپے

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ،

سالانہ	۵۲ شمارے	۵۴۵ روپے
ششماھی	۲۶ شمارے	۲۸۰ روپے

دوبی، ابوظہبی، افغانستان، بحرین، مسقط، قطر، شارجہ،

سالانہ	۵۲ شمارے	۲۶۵ روپے
ششماھی	۲۶ شمارے	۱۳۸ روپے

دفتر رابطہ :

معیار پبلیکیشنز، پوسٹ بکس ۳۱۹۵

۱۹۰-سی، بلاک ۲ - پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹

خصوصی رپورٹ

چیئرمین بھٹو

کو رات کے ۲ بجے شدید بخار کی حالت میں

لاہور سے راولپنڈی لیجایا گیا

پاکستان کی پہلی منتخب سیاسی شہری حکومت کے سربراہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور نواب محمد احمد خان کے مقدمہ قتل میں چیف جسٹس مشتاق حسین کی سربراہی میں لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ سے پھانسی کی سزا پانے والے جناب ذوالفقار علی بھٹو کوٹ لکھپت جیل سے راولپنڈی جیل منتقل کر دیئے گئے ہیں۔

سپریم کورٹ میں ان کی اپیل کی سماعت ۲۰ مئی سے شروع ہونے والی ہے، اس لئے لاہور سے انکی پنڈی منتقلی کی خبریں کئی روز سے آ رہی تھیں اور یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ پنڈی جیل میں سخت حفاظتی اقدامات کئے جا رہے ہیں، کوٹھری کی مرمت کی جا رہی ہے چھت پہ پہرے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو ۲ بجے کے قریب سابق وزیراعظم کو اچانک بتایا گیا کہ انہیں راولپنڈی لے جانا ہے، اس لئے فوراً تیار ہو جائیں ان کے وکیل حالانکہ پہلے ہی بتا چکے تھے کہ ان کی صحت بہت خراب ہے، ان کا وزن ۲۸ پونڈ کم ہو گیا ہے۔ اور وہ سفر کے قابل نہیں ہیں، اس کے باوجود انہیں آدھی رات کے وقت اٹھایا گیا اور انہیں پولیس کی ایک بڑی وین میں بٹھا دیا گیا۔ اس وین کے آگے پولیس کے دو ٹرک تھے، اور پیچھے پولیس کی دو وینیں بھی تھیں، جس میں خودکار اسلحے سے لیس پولیس کے مسلح نوجوان بیٹھے تھے۔ سڑک کے ذریعے پانچ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد یہ قافلہ راولپنڈی جیل پہنچا، جہاں حفاظتی اقدامات انتہائی سخت کئے جا چکے ہیں۔

راولپنڈی سے ہمارے نمائندے کے مطابق۔ منگل کی شام سے ہی راولپنڈی جیل کے اردگرد خاردار تاروں کے باڑ لگا دیئے گئے تھے۔ اور جیل کی چھت پر فوجی جوان پہرہ دینے لگے تھے، باخبر ذرائع کے مطابق جس کوٹھری میں چیئرمین بھٹو کو رکھا گیا ہے اس کے اردگرد بھی حفاظتی انتظامات فوج کے ذمے ہیں، اس کوٹھری کی چھت پر بھی فوجی جوان متعین کئے گئے ہیں۔

ادھر لاہور سے ہمارے نمائندے کے مطابق، کوٹ لکھپت جیل سے باہر فوجیوں کے کیمپ ختم کر دیئے ہیں، جیل کے اندر جو فوجی تھے، وہ بھی چلے گئے ہیں۔ اب یہ تمام انتظامات۔ فوجی جوانوں سمیت پنڈی منتقل کر دیئے گئے ہیں۔

ہمارے نمائندے نے لاہور سے اطلاع دی ہے کہ گذشتہ کئی دنوں سے چیئرمین بھٹو کی طبیعت شدید ناساز ہے۔ انہیں متلی کی مسلسل شکایت ہے، اور ہر چیز کھانے کے بعد انہیں قے ہو جاتی ہے، ان کا سر مسلسل چکراتا رہتا ہے، ان کے خصوصی وکیل جناب یحییٰ بختیار کے مطابق اتنی تیزی سے صحت گرنے کی وجہ یہ کال کوٹھری ہے، جو کنکریٹ کی بنی ہوئی ہے، اور جو آجکل کی شدید گرمی میں سارا دن تپتی رہتی ہے، دھوپ براہ راست کوٹھری کے اندر پڑتی ہے۔ اس کوٹھری میں دو آدمی بھی مشکل سے بیٹھ سکتے ہیں، حکومت کا یہ دعوٰی بالکل غلط ہے کہ انہیں تین کوٹھڑیاں دی گئی ہیں۔ انہیں دن بھر میں صرف ایک گھنٹہ دیا جاتا ہے۔ جس میں وہ چہل قدمی کر سکتے ہیں، اپنے ہاتھ پاؤں کو ہلنے جلنے کا موقع دے سکیں، رفع حاجت کے لئے فلش وغیرہ کا انتظام نہیں ہے۔

اس سلوک سے سابق وزیراعظم کا جسمانی طور پر متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ ان کے مسلسل احتجاج کے باوجود سہولتیں فراہم نہیں کی گئیں، اسی شدید بخار کی حالت میں انہیں پنڈی جیل منتقل کیا گیا ہے، جس سے ان کی صحت مزید خراب ہونے کا اندیشہ ہے، انکے سینئر وکیل نے تو یہ خدشہ بھی ظاہر کیا ہے۔ کہ ان کی صحت جس تیزی سے گر رہی ہے، اس کے پیش نظر خطرہ ہے کہ وہ اپیل کی سماعت سے پہلے ہی نہ چل بسیں۔

ادھر ہوم سیکریٹری سے ملاقات کی اجازت لینے کے بعد نظربند بیگم نصرت بھٹو پولیس کی حراست میں جیل پہنچیں تو انہیں بتایا گیا کہ ان کے شوہر کو پنڈی منتقل کر دیا گیا ہے اس لئے ملاقات نہیں ہو سکتی

OO

انقلابِ افغانستان کے بعد صحافیوں کو کوڑے لگنا

اِس سال کی سب سے بڑی خبر

قومی اتحاد کے رہنماؤں اور الیکشن سیل میں ملاقاتوں کا لامتناہی سلسلہ

افغانستان میں انقلاب کے بعد لاہور میں چار صحافیوں کو کوڑے لگائے جانے کی خبر۔ اس سال کی سب سے بڑی خبر تھی اس لئے بھی کہ مہذب دُنیا کی تاریخ میں پہلی بار پاکستان کو یہ شرف حاصل ہوا۔ کہ وہاں اہلِ قلم کو کوڑے لگائے گئے۔ اور اس لئے بھی کہ فوجی حکومت کے سربراہ جنرل ضیا" واضح طور پر صحافیوں کے لئے اس رعایت کا اعلان کر چکے تھے کہ انہیں الٹا لٹکایا جائے گا۔ لیکن کوڑے نہیں لگائے جائیں گے۔

جنرل ضیا۔ کے اس اعلان کے بعد "شر پسند" صحافیوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن آفرین ہے۔ لاہور کی فوجی عدالت پر جس نے صحافیوں، مزدوروں اور سیاسی کارکنوں کے درمیان اس امتیاز کو ختم کر دیا کہ جب جرم ایک ہے۔ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد۔ تو سزا بھی ایک ہونی چاہیئے۔ قید بامشقت اور کوڑے۔ پی۔ ایف یو جے کی تاریخ میں ایک اور اہم باب کا اضافہ ہو گیا۔ اور مسعود اللہ خان۔ خاور نعیم ہاشمی، اقبال جعفری اور ناصر زیدی۔ اس جدوجہد میں اتنے بلند مقام پہ پہنچ گئے۔ جو برسوں کی جدوجہد کے بعد بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ چار اس اعزاز کو کیوں پا سکے اور دوسرے صحافی اس سے کیوں محروم رہے۔ انہوں نے بھی بھوک ہڑتال کی تھی۔ باقی نے بھی۔ لیکن کوڑے ان کا مقدر کیوں ٹھہرے۔ وزارتِ اطلاعات کے افسر سرگوشیوں میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے افواجِ پاکستان کو گالیاں دی تھیں۔ لیکن واضح طور پر اس کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ کوڑے لگے، ساری دُنیا کو پتہ چلا۔ پوری دُنیا حیران رہ گئی کہ یہ کیسا ملک ہے۔ جہاں انسانوں کو کوڑوں کی سزا آج بھی دی جا رہی ہے۔ اور ان لوگوں کو جو روشنی پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو باخبر رکھتے ہیں۔ دُنیا تو ورطۂ حیرت میں ہے۔ لیکن ہم ۱۹۷۱ء کی بربریت یاد کر لیتی ہے۔ ہم چھ سال تک بیرونی ممالک میں اپنا وقار دوبارہ حاصل کرنے کے بعد پھر تیزی سے اُسے بربریت اور درندگی میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اسلامی سزاؤں کا نام لے کر ہم کیسے بیوقوف بنا رہے ہیں۔ انگریز آقاؤں کے دور سے جیلوں میں لگنے والے کوڑے ۵ جولائی کے بعد سے "اسلامی سزا" کیسے ہو گئے اسلامی سزا قاضیوں کی عدالتوں سے دی جا سکتی ہیں۔ اسلامی سزا کا دعویٰ کرنے والو۔ ویسے مصنف بھی لاؤ۔

میں صحافیوں اور دوسرے لوگوں میں کوڑوں کی سزا کے لئے امتیاز کا قائل نہیں ہوں۔ سب انسان ہیں ہر شخص آزاد پیدا ہوا ہے۔ کوئی اگر اخلاقی جرم بھی کرتا ہے تو اس کے اسباب دیکھے جانے چاہئیں۔ اخلاقی مجرم کو ایسی سزائیں دے کر، اُسے عزتِ نفس سے بھی محروم کر کے آپ اُسے مستقل مجرم تو بنا سکتے ہیں لیکن اس کی اصلاح نہیں کر سکتے۔

ملک میں جب انسانوں کی یوں "تذلیل" ہو رہی ہے تو ہمارے رہنمایانِ کرام۔ الیکشن سیل سے ملاقاتیں کر رہے ہیں، سیاسی حکومت سے تو ملاقات سے یہ لوگ انکار کر دیا کرتے تھے۔ کہ انتخابات کی تاریخ مقرر کرو۔ ہم مذاکرات نہیں کریں گے۔ اب ایک سال سے ملاقاتیں ہی ہو رہی ہیں۔ دِل ہی نہیں بھرتا۔

قومی حکومت کے قیام کی کوششیں اسی طرح جاری ہیں۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ این ڈی پی نہیں بننے دے رہی۔ کبھی تحریکِ استقلال کبھی بلوچ رہنما حالانکہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اگر فوجی حکومت چاہے تو اگلے دِن قومی حکومت بن سکتی ہے۔ وہیں ہلانے والے سیاست دان کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ان میں سے کسی کو بھی قومی حکومت میں رکاوٹ بننے کا کریڈٹ دینا۔ ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے علاوہ ساری سیاسی اور غیر سیاسی طاقتیں، دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ موجودہ صورتِ حال سے ان میں سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہے اس صورتِ حال میں مطمئن ہونے کے لئے کچھ ہے بھی نہیں۔ افغانستان میں انقلاب اگرچہ وہاں کا داخلی معاملہ ہے۔ لیکن ہمارے سیاستدان اس طرح بوکھلائے پھر رہے ہیں۔ جیسے اُن کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ موجودہ فوجی حکمرانوں سے ملاقات کے فوراً بعد وہ ایسی بوکھلاہٹ کا اظہار کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ حکمران بھی اس بوکھلاہٹ میں شامل ہیں۔ لیکن جب نوابزادہ نصراللہ کے نئی افغان حکومت کو تسلیم نہ کرنے

کے مشورے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر پاکستان افغان حکومت کو تسلیم کر لیتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت اس لوکھلاہٹ میں برابر کی شریک نہیں ہے

قومی حکومت، شہری حکومت یا راؤ فرمان فارمولا۔ ان سب سے ایک حقیقت کی غمازی ہوتی ہے کہ فوجی حکمران، سیاست دان، سب موجودہ پوزیشن میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ کیوں۔ اس لئے کہ مسائل کے حل اور حالات پر قابو پانے میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ خود جنرل ضیاء نے مارشل لاء کو ناگوار تجربہ۔ اور حکومت کو صرف عوام کے منتخب نمائندوں کا حق قرار دیا تھا۔ لیکن انہوں نے ۹۰ روزہ "فیر پلے" کے سیدھے سادے مشن سے تجاوز کرکے جب سے احتساب وغیرہ کی ذمّہ داریاں اپنے سر لیں۔ اس کے بعد حالات نے ہی ثابت کیا کہ حکومت کا کاروبار چلانا منتخب نمائندوں کا کام ہی ہے۔ اس "فیر پلے" کا جو مقصد تھا۔ وہ عام انتخابات کا انعقاد تھا وہی مسئلے کا حل بھی تھا۔ آج بھی مسئلے کا وہی حل ہے کیونکہ مسائل میں مبتلا ۷ کروڑ ہیں۔ جب تک ان سب کی مرضی کے مطابق کوئی بات نہیں ہوتی۔ تو مجموعی طور پر اطمینان کی فضا کیسے ہو سکتی ہے۔

پیپلز پارٹی کو تو خیر نہ بولنے کا موقع ملتا ہے اور نہ اس کے رہنما آپس میں مل سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے چند ایک کے علاوہ سب جیل میں ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باعث یہ بھی اعلان نہیں کیا جا سکا کہ جو عہدیدار جیل میں چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ قائم مقام کون ہوگا۔ پیپلز پارٹی کے ترجمان "روزنامہ مساوات" کو کراچی لاہور۔ دونوں جگہ حکومت نے بند کر دیا ہے۔ حال ہی میں پیپلز پارٹی کے ایک ممتاز رہنما۔ سابق وفاقی وزیر پیداوار اور سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن جناب فاروق لغاری نے کراچی میں اخباری نمائندوں سے غیر رسمی ملاقات کی۔ جس سے ملک کی موجودہ صورت حال۔ بین الاقوامی مسائل۔ پڑوسی ممالک سے تعلقات اور پارٹی کے تنظیمی مسائل پر پارٹی کا نقطۂ نظر سامنے آیا۔ فاروق لغاری اگرچہ حکومت کی سیاست کے لئے اہل قرار دیئے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کا حکومت کے پسندیدہ گروپ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ مولانا کوثر نیازی تو سمجھتے ہیں کہ انہیں پارٹی سے نکلوانے میں فاروق لغاری ہی پیش پیش تھے۔ اور بے نظیر بھٹو کو قائم مقام چیئرمین بنانے کی تجویز غیر رسمی طور پر جس اجتماع میں سامنے آئی۔ وہ بھی فاروق لغاری صاحب کے ہاں ہی منعقد ہوا تھا۔ فاروق لغاری۔ ڈیرہ غازی خان کے با اثر قبیلے لغاری کے سربراہ ہیں۔ آکسفورڈ سے تعلیم یافتہ۔ ابھی جوان ہیں۔ ملک کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس لئے ابھی تک پیپلز پارٹی سے وابستہ ہیں۔ چیئرمین بھٹو سے وفاداری استوار رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ پیپلز پارٹی پر تخریب کاری کا الزام بالکل غلط ہے۔ وہ ایک جمہوری پارٹی ہے۔ جمہوریت پر یقین رکھتی ہے۔ اس کا مطالبہ صرف اور صرف انتخابات ہیں۔ وہ فوجی حکومت کے قیام سے لیکر اب تک صرف اسی مقصد کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ اسی لئے اس کے کارکن جیلوں میں صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔

فاروق لغاری صاحب جنہیں اس وقت قریباً پارٹی کے ترجمان کی حیثیت ہی حاصل تھی۔ انہوں نے واضح طور پر کمال اظفر۔ نصر اللہ خٹک اور ربّانی صاحب کا نام لیکر کہا کہ فوجی حکمرانوں سے ملاقاتیں کرکے ان حضرات نے پارٹی سے اپنا تعلق ختم کر لیا ہے۔ اس لئے یہ اب اپنے آپ کو پارٹی سے خارج سمجھیں۔ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ملے گی تو سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی ان کے باقاعدہ اخراج کا اعلان بھی کر دے گی۔

انہوں نے پیپلز پارٹی کی طرف سے افغانستان حکومت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں پاکستانی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ کہ پاکستان کے عوام کی خواہش تھی۔ کہ نئی انقلابی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اتحاد کے لیڈر افغانستان کی حکومت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ نہ صرف کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہے۔ بلکہ ان سے ان رہنماؤں کا ذہنی دیوالیہ پن بھی ظاہر ہوتا ہے۔

انھوں نے ملک کی اقتصادی صورتِ حال پر بھی افسوس کا اظہار کیا۔

اب جب کہ سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی اپیل کی سماعت شروع ہونے والی ہے۔ اور کافی عرصے سے غیر ممالک سے مزید کوئی اپیل بھی نہیں آئی۔ ایسے میں برطانیہ کی طرف سے یہ واضح اعلان جو وہاں کے وزیر خارجہ نے کیا ہے کہ اگر مسٹر بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت پر عمل درآمد کیا گیا تو اس سے برطانیہ اور پاکستان کے درمیان تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ اعلان ان دنوں میں معنی خیز ہے جب کہ دائیں بازو کی تنظیمیں لندن میں کافی سرمایہ خرچ کرکے برطانوی ذرائع ابلاغ پر دباؤ ڈال رہی ہیں کتابچے تقسیم کر رہی ہیں۔ پاکستانی سفارت خانے نے برطانوی حکومت سے احتجاج کیا ہے۔ اس وقت دارالعوام کے ڈیڑھ سو ارکان کی قرارداد پر وزیر خارجہ کا واضح بیان۔ عالمی رائے عامہ میں اضطراب کی نشاندہی کرتا ہے۔ کچھ لوگ اُسے افغانستان کے واقعات کے بعد مغرب کی طرف سے ایک مصالحت کی کوشش کہتے ہیں۔ افواہیں تو یہ بھی اُڑ رہی ہیں کہ امریکہ کو بھی کمیونزم روکنے کے لئے بھٹو صاحب سے مصالحت کرنی پڑے گی۔ مگر یہ سب افواہیں ہیں اس طرح جیسے چیئرمین بھٹو کو جیل سے اغوا کرنے کے لئے بڑی عالمی طاقت کو ملوث کیا جا رہا ہے۔ لیبیا پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ لندن میں غلام مصطفےٰ کھر اور غلام مرتضیٰ بھٹو کے تمام اخراجات برداشت کر رہا ہے۔ فلسطینیوں پر پیپلز پارٹی کی حمایت کے لئے بھی کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔

قومی حکومت، قومی اتحاد، کوثر نیازی گروپ اور حکومت کا مسئلہ ہے۔ امن و امان حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن بے چارے عوام کیا کریں۔ ان کی بھی تو کوئی سنے۔ قومی اتحاد کے رہنما جنہوں نے عوام کے کندھوں پر چڑھ کر "آمریت" "بھٹو شاہی" کا خاتمہ کیا۔ مثالی جمہوریت قائم کرنے کے لئے۔ وہ رہنما آج کل عوام کو لفٹ ہی نہیں دیتے۔ کیونکہ انہیں ملاقاتوں سے اور جوڑ توڑ سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کوئی ان کی تو سنے!

∞

پی ایف یو جے اور ایپنک کی مرکزی مجلسِ عمل کے ارکان (دائیں سے بائیں) عارف علی شاہ، اسلم شیخ، نثار عثمانی، منہاج برنا، حفیظ راقب، ولی محمد واحد اور ریاض ملک

مساوات کو کسی ٹرسٹ کے حوالے کیا گیا تو.......

کسی اخبار کا مستقبل محفوظ نہیں رہیگا

اشرف شاد

آزادی صحافت کے لئے پاکستان بھر کے صحافیوں اور اخباری کارکنوں کی جدوجہد کو بیس روز مکمل ہو گئے ہیں، اس عرصے میں کوڑے اور قید کی سزا پانے والوں، گرفتار ہونے والوں اور پنجاب بدری کا انعام پانے والوں کی تعداد ایک سو دس سے تجاوز کر گئی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں حکومت کی پوری مشینری جس میں پورا محکمۂ اطلاعات آئی ایس پی آر، جماعتِ اسلامی کے ٹٹ پونجئے اور نام نہاد صحافتی جنگ اور دوسرے بڑے اخباروں کی انتظامیہ اور اخباروں میں کام کرنے والے حکومت کے طفیلیے بھی شامل ہیں اب تک اپنی شبانہ روز کوششوں کے بعد صرف حریت کے ۹۴ ملازمین اور ایک عدد نفیس رقم کے مخالفانہ بیانات حاصل کر پائی ہے جنھیں سرکاری ذرائع ابلاغ دن رات نشر کر کے خود اپنا مذاق اڑواتے رہے۔

اسی طرح کا بیان سرکاری نیوز ایجنسی اے پی پی میں بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس ادارے کے ایک سینئر رکن مختلف درجوں کے ملازمین کو ڈرا دھمکا کر، اپنے عہدے کا رعب ڈال کر ایسا ہی ایک بیان حاصل کر کے ریڈیو ٹی وی کے خبر ناموں میں پہنچانے کا اہتمام کر رہے ہیں، جبکہ جنگ کراچی کی ایمپلائز یونین کے نائب صدر کا ایک بیان تیار کرا کے اخبارات کو بھجوایا، جب یونین کو اس کا علم ہوا تو یہ بیان سب جگہ سے واپس لے کر اس سازش کو ناکام بنا دیا گیا، جنگ سمیت کسی بھی اخبار نے اس بیان کو شائع نہیں کیا صرف جسارت نے تمام صحافتی اصولوں کو توڑتے ہوئے واپس لئے جانے والے اس بیان کو دو کالمی سرخی لگا کر شائع کیا۔

لاہور میں حکام نے بڑے شاطرانہ انداز میں مرکزی مجلس کے ارکان کو گھروں پر چھاپہ مار کر گرفتار کیا، ان میں پنجاب یونین آف جرنلسٹس (پی یو جے) کے صدر ریاض ملک بھی شامل تھے، جو مرکزی مجلس عمل کے رکن بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ پی یو جے کے نائب صدر ہمراز احسن کو جو مرکزی مجلس عمل کے رکن بھی نہیں تھے محض اسلئے گرفتار کیا گیا کہ وہ پی یو جے کے قائم مقام صدر کا عہدہ نہ سنبھال سکیں اور دوسرے نائب صدر مسٹر محمود جعفری اور سیکریٹری رشید صدیقی کے ذریعے حکومت صحافیوں کی اس تحریک میں "کنفیوژن" پھیلانے میں کامیاب ہو سکے۔ لیکن اس کی یہ کوششیں بھی تا حال کامیاب نہ ہو سکیں اور محمود جعفری اور رشید صدیقی نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ صحافیوں کی یہ تحریک اسی طرح جاری رہے گی اور اس کے لئے وہ سینے پر گولی کھانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے (مطبوعہ جنگ) اس کے علاوہ بھی حکومت کے علم میں شاید یہ بات بھی نہیں تھی کہ بھوک ہڑتال شروع کرنے اور تحریک چلانے کا فیصلہ صحافیوں اور اخباری صنعت کے کارکنوں کی وفاقی تنظیموں پی ایف یو جے اور ایپنک کی مجالسِ عاملہ کے اجلاسوں میں ہوا تھا اور اسکے لئے جو مرکزی مجلس عمل اور مذاکراتی ٹیم بنائی گئی تھی قانونی طور پر وہی اس تحریک کے سلسلے میں یا مذاکرات کے لئے مجاز ہے۔ بات پی یو جے کی حدود سے بہت آگے کی ہے۔

لاہور میں تحریک اسی دم خم سے بلکہ اس سے زیادہ زور و شور سے جاری ہے۔ اخباری کارکنوں نے اپنے قائدین کی گرفتاری کے بعد اس پرچم کو جس طرح اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھا ہے اس پر پوری برادری انہیں سلام کرتی ہے، دوسری مرکزی مجلسِ عمل کے ارکان کی گرفتاری کے بعد بھی فوری طور پر نئی مجلس عمل قائم کر دی گئی جسکے ارکان کو گرفتاری سے بچانے کے لئے ان کے ناموں کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود ملک بھر سے اخباری کارکنوں کے گروپ بدستور لاہور پہنچ رہے ہیں اور روزانہ بھوک ہڑتال پر بیٹھنے والوں کا

سلسلہ ایک روز کے لئے بھی منقطع نہیں کیا جاسکا ہے
آزادیٔ صحافت کے لئے پی ایف یو جے اور ایپنک
کی یہ جدوجہد آج ملک میں بحالیٔ جمہوریت کی جدوجہد
کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی
ہوسکتا ہے کہ لکشمی چوک سے دفتر مساوات تک مختلف
طبقے کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہار پھول نچھاور کرنے
جمع ہوتی ہے، ان پر پولیس کا لاٹھی چارج بھی اب روز
مرہ کا معمول بن گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس تحریک
کو سیاست کا نام دینے والے وہی لوگ ہیں جو ملک
میں جمہوریت کی بحالی کے سب سے بڑے مخالف ہیں
جمہوریت کی بحالی جنہیں اپنا مدفن نظر آتی ہے اور جن
کے رشتے عوام اور انکی خواہشات سے نہیں، محض
دیسی و بدیسی آقاؤں کے مفادات سے وابستہ ہیں۔

ایک طرف صحافی اور اخباری کارکن پورے تحمل
نظم وضبط اور عزم و حوصلے کے ساتھ اپنی تحریک کو آگے
بڑھا رہے ہیں، دوسری طرف حکومت کا رویہ ابھی تک
غیر مفاہمانہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مسئلے پر نوکر شاہی
پوری طرح جماعت اسلامی کے حلقوں کی مشاورت
سے اور انہیں کی عینک لگا کر اس مسئلے کو دیکھ رہی
ہے۔ یا پھر شاید یہ وزارت اطلاعات میں زیڈ اے
سلیری جیسی شخصیت کے اضافہ کا شاخسانہ ہے کہ
حکومت کو ابھی تک یہی تاثر دینے کی کوشش کی جارہی
ہے کہ وہ اپنے بعض لے پالکوں کے ذریعے اس
تحریک کو ختم کردیں گے۔ لیکن جو تحریک سزاؤں،
کوڑوں اور ملازمتوں سے برطرفیوں جیسی صعوبتوں
کے بعد بھی اسی جوش وخروش سے جاری ہے اسے
اس طرح کے ہتھکنڈوں سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ان
لوگوں نے شاید اخباری کارکنوں کی ماضی کی جو تحریکیں
رہی ہیں اسکی داستانیں نہیں پڑھیں، دوسری
طرف حکومت ان مضمرات سے بھی آگاہ نہیں ہے
جو ان کے ہٹ دھرم رویہ اختیار کرنے کے نتیجہ میں
پیدا ہوئے ہیں۔ صحافیوں کی اس تحریک کو عالمی
رائے عامہ بڑی ہمدردی کی نظر سے دیکھ رہی ہے،
جسکے نتیجے میں اسے کچلنے کے لئے جابرانہ ہتھکنڈوں
کے استعمال سے دنیا بھر میں موجودہ حکومت کا امیج
متاثر ہوسکتا ہے۔ جو اس حکومت کے لئے کوئی خوشگوار
صورتحال نہیں ہوگی۔ حکومت اگر یہ سمجھتی ہے کہ اخباری
کارکنوں کے مطالبات تسلیم کرنے کے بعد اس کا
وقار مجروح ہوگا تو اسے یہ بات بھی مدنظر رکھنی پڑیگی
کہ سینکڑوں کی تعداد میں صحافیوں کو سزائیں دے کر، کوڑے
مار کر اور انہیں نوکریوں سے نکال کر بھی وہ کوئی
نیک نامی حاصل نہ کرسکے گی۔ بلکہ یہ صورت شاید
اس کے لئے زیادہ تباہ کن ہوگی۔

سرکاری فارمولا

حکومت سے جو حلقے اس وقت زیادہ قریب
ہیں کوڑوں کی سزاؤں کے بعد انکی طرف سے جو
ردعمل آیا ہے اس میں ان سب نے کچھ نئی تجاویز
پیش کی ہیں۔ ظہور الہیٰ اور کوثر نیازی قبیل کے ان
لوگوں کی تجاویز حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے
مماثل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سرکاری
فارمولا وضع کرکے اس کے لئے راہ ہموار کرنے کی
کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس میں بنیادی بات یہ
ہے کہ مساوات کراچی اور لاہور کو زید بن سلطان
ٹرسٹ (سابقہ پیپلز فاؤنڈیشن ٹرسٹ) کے حوالے
کردیا جائے۔ حکومت اگر واقعی اس قسم کی کسی
تجویز پر سنجیدگی سے غور کررہی ہے تو اس کے نتیجے میں
پوری صنعت کے لئے خطرات پیدا ہوسکتے ہیں، پی ایف
یو جے اور ایپنک کے ترجمان نے اس طرح کی تمام تجاویز
کو یکسر مسترد کردیا ہے۔ لیکن اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی
سے اے پی این ایس کو غور کرنا چاہیئے۔ یہ روایت
اگر ڈال دی گئی تو پھر کسی اخبار کا مستقبل محفوظ نہیں
رہے گا۔ حکومتیں ہمیشہ نہیں رہتیں تبدیل بھی ہوتی ہیں،
اور اگر ہر ایسی تبدیلی کے نتیجے میں مخالفت کی آرا رکھنے
کے لئے اخبارات کو سرکاری ٹرسٹ کے حوالے کردینے
کا سلسلہ چل نکلا تو پھر کسی اخبار کا مستقبل محفوظ نہیں
رہے گا۔ جنگ کے میر خلیل الرحمٰن کو جن کی ہمدردیاں
اس تحریک کے سلسلے میں یقیناً ہمیشہ کی طرح اس بار
بھی حکومت ہی کے ساتھ ہیں، اس پر توجہ دینی چاہیئے
کہ کل کسی تبدیلی کی صورت میں اگر انکے اخبارات
کروڑوں روپے کی املاک کے ساتھ کسی سرکاری ٹرسٹ
کے حوالے کردیئے گئے تو وہ کیا محسوس کریں گے۔؟
یہی صورت کسی دور میں نوائے وقت اور جسارت کے
ساتھ بھی پیش آسکتی ہے، حکومت کو کوئی ایسا فارمولا
وضع کرنے کے بجائے اخبار نویسوں کے مسائل اور
مطالبات پر کوئی حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے

منہاج برنا کی برطرفی

لیکن حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کے
بجائے حکومت کی طرف سے اب تک سزاؤں اور
کوڑوں کی شکل میں خیر سگالی کے مظاہرے کے بعد اب
پی ایف یو جے اور ایپنک کے سربراہ کو ملازمت سے
فی الفور برطرف کرنے کے احکامات آئے ہیں۔ یہ
ایک طرف تو اس بات کی نوید ہے کہ تحریک میں شامل
باقی لوگوں کے ساتھ بھی یہ ہوسکتا ہے تو دوسری طرف
نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین جمیل الزماں نے
اپنی پرانی خواہش کو پورا کیا ہے۔ یہ موصوف حکومت
کے ایک ایسے نادان دوست کا کردار ادا کررہے
ہیں۔ پی پی ایل اور مشرق میں انہوں نے گھناؤنی
سازشوں کا جو جال بچھایا ہے اس کا نتیجہ ان کے
اور حکومت دونوں کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوگا۔
اور جب تک اخبارات کے بارے میں سرکاری رویہ
متعین کرنے کا کام ان جیسے لوگوں کے ہاتھ میں رہا
حکومت اور پریس کے تعلقات کبھی معمول پر نہ آسکیں گے۔

منہاج برنا صاحب پہلی مرتبہ برطرف نہیں ہوئے
ہیں، ہر نئی حکومت ہمیشہ انکی برطرفی کا پروانہ بھی
ساتھ لے کر آئی ہے۔ یہ انکی پانچویں برطرفی ہے، اس
سے پہلے ۱۹۵۹ء میں، پھر ۱۹۶۴ء میں، یحییٰ خان
کے دور میں ۱۹۷۰ء میں اور پھر اس دور میں پہلی بار
۱۹۷۷ء میں اور دوسری بار اب ۱۹۷۸ء میں ملازمت
سے برطرف کئے جاچکے ہیں۔ لیکن انکی یا اخباری صنعت
میں کام کرنے والے سرگرم ٹریڈ یونین لیڈروں کی
برطرفیاں نہ پہلے انہیں راہ سے ہٹا سکی ہیں — نہ
اب ہٹا سکیں گی۔

○○

ایم احمد کی رپورٹ

لاہور

جناب اسلم شیخ، شفقت تنویر مرزا احمد علی اور محمد صادق بھوک ہڑتال کے لئے مساوات کے دفتر کی جانب جا رہے ہیں

لاہور میں اخبار نویسوں کی جدّوجہد جاری ہے

قید اور کوڑوں کی سزاؤں کے باوجود حوصلے بلند ہیں

لاہور

میں آزادیٔ صحافت کی تحریک پورے زور شور سے جاری ہے۔ صحافی سنچری مکمل کر چکے ہیں۔ مسعود اللہ خان، ناصر زیدی، اقبال جعفری، اور خاور نعیم ہاشمی نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانچ پانچ کوڑے کھا کے عالمی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ شام کو روزانہ چھ بجے کھیل کے وقت منٹگمری روڈ پر روزنامہ مساوات کے دفتر کے سامنے اور دائیں اور بائیں دور دور تک تماشائیوں کا ہجوم ہوتا ہے جو کھلاڑیوں کو دیکھ کر پر زور تالیاں بجاتے ہیں۔ بعض جوش میں آکر نعرے بھی لگا دیتے ہیں۔ اور یوں مخالف ٹیم انہیں بھی پکڑ کر دوسری ٹیم میں شامل کر دیتی ہے۔ اس کھیل کی خصوصیت یہ ہیں کہ تالیاں صرف بیٹنگ کرنے والی ٹیم کے حق میں بجتی ہیں۔ باؤلنگ کرنے والی ٹیم کو تالیوں کے بجائے مخالفانہ نعرے سننے کو ملتے ہیں۔

صحافیوں کی ٹیم کے کپتان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ کام کرنے والے قائم مقام کپتانوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ مخالف ٹیم کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح صحافیوں کے حوصلے پست ہوں اور وہ میدان چھوڑ جائیں۔ لیکن یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی کوڑوں، قید بامشقت اور ہراساں کرنے کی دوسری کارروائیوں کے باوجود گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے اور ملک بھر کے صحافی اس جہاد میں حصّہ لینے کے لئے جوق در جوق پہنچ رہے ہیں۔

صحافیوں کو کوڑے لگنے کی خبر نے نہ صرف ملک کے عوام کو بلکہ پوری دنیا کے باضمیر عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس خبر پر باضمیر شخص خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو۔ تلملا کر رہ گیا۔ مولانا مودودی سے لیکر مولانا عبدالستار نیازی تک سبھی نے اس ظالمانہ اقدام کی مذمت کی حکومت کا خیال تھا کہ کوڑوں کی دہشت صحافیوں کو قدم روکنے پر مجبور کر دے گی۔ لیکن کوڑوں کی سزا کے دوسرے دن نہ صرف چار صحافیوں نے معمول کے مطابق گرفتاریاں پیش کیں بلکہ ان کے ساتھ تین خواتین بھی شامل ہو گئیں ......

کوڑوں کی سزا کے بعد حکومت نے صحافیوں کی جدوجہد کو ناکام بنانے کے لئے ایکشن کمیٹی کے چھ اراکین کو بھی گھروں سے گرفتار کر لیا۔ لیکن ایکشن کمیٹی کے اراکین کی گرفتاری کے دوسرے دن صحافیوں نے اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ آزادیٔ صحافت کی تحریک میں حصّہ لیا۔

اب تک حکومت ایک سو دس سے زائد صحافیوں اور اخباری کارکنوں کو گرفتار کر چکی ہے اور ان میں سے اکثر کو چھ ماہ سے ایک سال تک قید بامشقت کی سزائیں سنائی جا چکی ہیں مگر شہر شہر سے لاہور پہنچنے والوں کا سلسلہ اسی جوش و خروش سے جاری ہے۔

○○

پشاور

ثناء اللہ

یونیورسٹی میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مکمل فتح

وہ جدوجہد میں ہیں، اس لیے طلبہ نے انھیں اپنا لیڈر مان لیا

پشاور یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سالانہ عام انتخابات ہو گئے ہیں اور پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن اس سال اپنی پوری کابینہ کے ساتھ فاتح کی حیثیت سے اُبھر کر آئی ہے جب پشاور یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ عام انتخابات ہوئے تھے تب بھی پیپلز اسٹوڈنٹس جیتی تھی مگر اس وقت اسے پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن (جس کے صدارتی امیدوار افراسیاب خٹک تھے) کے ساتھ سخت مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ دوسری مرتبہ عام انتخابات کیمپس میں بم کے دھماکے سے حیات محمد خان شیرپاؤ کی موت کی وجہ سے نہیں ہو سکے تھے تیسری مرتبہ انتخابات ہوئے تو پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن اس لئے نہ جیت سکی کہ اس کا لیڈر جیل میں نہ تھا۔ پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار تھی سرکار کی سرپرستی کی تہمت بھی سر تھی اور امیدواروں کا چناؤ بھی چند وزیروں کے بنگلوں میں اپنی پسند پر کیا گیا تھا۔ اُن امیدواروں کے ہاتھ بھی صاف نہ تھے اور ان کی شامیں بھی اکثر وزیروں کے بنگلوں پر گذرا کرتی تھیں۔ یہ لوگ کچھ پروفیشنل طالب علم لیڈر ہونے کی شہرت بھی رکھتے تھے۔ اور یہ تمام باتیں پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے لئے کریڈٹ کا باعث بنیں مگر اب کی مرتبہ جب انتخابات ہوئے تو صورت حال یکسر مختلف تھی۔ پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن مظلوم بن کر سامنے آئی اب ان کے کارکن وزیروں کی کوٹھیوں اور بنگلوں کے بجائے جیلوں میں تھے۔ اب حکومت کی شفقت کا ہاتھ بھی ان کے سر پر نہ تھا۔ اب کوئی انہیں یہ طعنہ بھی نہ دے سکتا تھا کہ الیکشن میں سرکاری پیسہ خرچ ہو رہا ہے۔ یا وزیروں کی کاریں استعمال ہو رہی ہیں اس مرتبہ کیمپس میں پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن پوسٹر بازی کے لحاظ سے بھی غربت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ اس مرتبہ پیپلز والوں کے امیدوار بھی واقعتاً خالص طالب علم تھے ان کے ہاتھ بھی تقریباً صاف تھے کہ ان پر وزیروں کی قربت کی تہمت بھی نہ جچتی تھی اور ان کی صفوں میں غیر طالب علم بھی عنقا تھے اس مرتبہ پیپلز والوں کا رول اپوزیشن کا رول تھا۔ اس مرتبہ ان کا لیڈر جیل میں تھا۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں نہ تھا جب کہ پختون والوں کا لیڈر جیل میں نہ تھا۔ لندن میں تھا۔ اس مرتبہ پیپلز والے جدوجہد کے دور میں داخل ہو چکے تھے جب کہ پختون اور اسلامی جمعیت والے جدوجہد کے دور سے باہر نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ انتخابات سے قبل یونیورسٹی کیمپس میں ایک ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا۔ اساتذہ کو زدوکوب کیا گیا اور وائس چانسلر کے گھر پر حملہ ہوا۔ چونکہ پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدارتی امیدوار خالد خان کو نااہل قرار دے دیا گیا تھا اور اُس کے کاغذات نامزدگی بعض وجوہ کی بنا پر نادرست قرار دے دیئے گئے تھے۔ اس پر پختون والوں نے الیکشن کمیٹی میں شامل بعض اساتذہ پر کرسیاں پھینکیں اور انہیں مکے بھی مارے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پختون کے امیدواروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم پولنگ سے چند روز قبل انہیں رہا کر دیا گیا اور وائس چانسلر نے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے ان کے صدارتی امیدوار کو اہل قرار دے دیا اس واقعہ کا پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اساتذہ کے ساتھ ان کے سلوک کو مخالف جماعتوں نے خاصا اچھالا پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پاس اب کی مرتبہ کوئی پروگرام نہ تھا بلکہ اس مرتبہ اس کے دو دھڑے ہو گئے تھے ایک دھڑا ترقی پسند افراسیاب گروپ کے نام سے ابھرا جس نے دوسرے دھڑے کے خلاف خاصا کام کیا اگرچہ پختون والے اپنی ہار کا ذکر کرتے وقت اس دھڑے بازی کو کریڈٹ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند افراسیاب گروپ سو سے زیادہ تعداد میں نہ تھا مگر اس گروپ نے پیپلز والوں کی خاصی اخلاقی مدد کی اور ان کے حوصلے بلند رکھے بلکہ جب کہ پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن جیت گئی تو ان کے کامیاب امیدواروں کے ساتھ ترقی پسند افراسیاب گروپ کے ناکام صدارتی امیدوار اسد اللہ آفریدی اور شیر محمد نے تقاریر بھی کیں۔ اور ان کی جیت کو ترقی پسندوں کی جیت قرار دیا۔ ان انتخابات میں طالبات کا کردار بھی بڑا اہم رہا بلکہ ان کی حمایت فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ طالبات کی اکثریت نے پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو ووٹ دیئے کیونکہ پی ایس ایف کے مطابق انہوں نے طالبات میں بڑا کام کیا تھا۔ افراسیاب والی پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کہنا ہے کہ انہوں نے ووٹ پیپلز والوں کو دیئے جب کہ پختون اسٹوڈنٹس

باقی صفحہ ۔۔ پر

کمال اظفر، نصر اللہ خٹک، رئیسانی اپنے آپ کو پارٹی سے خارج سمجھیں

جمہوریت کی جدوجہد میں قومی اتحاد پیپلز پارٹی سے تعاون کرے

کراچی میں فاروق لغاری کی اخباری نمائندوں سے غیر رسمی بات چیت

پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما اور سابق وزیر پیداوار مسٹر فاروق لغاری نے کہا ہے کہ پیپلز پارٹی کو تخریبی کارروائیوں میں ملوث کرنا ایک انتہائی گھناؤنی سازش ہے اور یہ کارروائی ایک منصوبے کے تحت عمل میں لائی جا رہی ہے۔ وہ اپنی رہائش گاہ پر صحافیوں سے ایک ملاقات میں غیر رسمی بات چیت کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ دراصل اس قسم کا پروپیگنڈا وہ لوگ کر رہے ہیں۔ جنہیں ہمیشہ اپنا مفاد عزیز رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی ملک کے ہر طبقے میں ہر دلعزیز ہے اور جمہوری روایتوں کی حامی ہے، اس کا ہر طبقہ پر اثر ہے اور اس کی بھاری اکثریت سے متوقع فتح کی وجہ سے انتخابات ملتوی کرائے گئے لہٰذا ایک ایسی پارٹی کو تخریبی کارروائیوں میں ملوث ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بعض حلقے اس قسم کی بدگمانیاں بھی پھیلا رہے ہیں کہ اگر پیپلز پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آ گئی تو وہ اپنے اوپر کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لے گی۔ یہ ایک بہتان ہے۔ کیونکہ پیپلز پارٹی نے کبھی بھی اس قسم کی بات سوچی بھی نہیں ہے۔ ہم کبھی بھی یہ نہ چاہیں گے کہ جمہوری ادارے تباہ ہو جائیں یا ہم اپنے محافظوں کے خلاف باتیں کریں ہمارے ذہنوں میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ہم فوج کے وقار کو مجروح کریں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قومی اتحاد کے رہنماؤں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور ہمارے ساتھ ملکر جمہوریت کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ پیپلز پارٹی کے جن رہنماؤں نے پارٹی کے نظم وضبط سے انحراف کیا ہے انہیں اپنے آپ کو پارٹی کے دائرے سے باہر تصور کرنا چاہئے۔ انہوں نے نصر اللہ خٹک، غوث بخش رئیسانی اور مسٹر کمال اظفر کا نام لیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پارٹی کے اصولوں سے انحراف کر کے اپنے آپ کو عوام اور کارکنوں کی نظروں میں گرا لیا ہے انہوں نے کہا کہ انہیں اس بات پر پختہ یقین ہے کہ جیسے ہی سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھائی جائے گی ایسے تمام لوگوں کو پارٹی سے نکال دیا جائے گا، جنہوں نے پارٹی کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے مقامی اخبارات میں شائع ہونے والا وہ بیان جو مسٹر کمال اظفر نے دیا ہے حقائق سے بہت دور ہے مسٹر فاروق لغاری نے کہا کہ پارٹی کے آئین کے تحت چیئرمین کو مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی رکن کو جب مناسب سمجھے نکال دے اور پارٹی کی قائمقام بیگم نصرت بھٹو کے پاس بحیثیت قائمقام چیئرمین تمام اختیارات موجود ہیں ان لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو پارٹی سے خارج سمجھیں۔

انہوں نے کہا کہ وہ اپنی اور پارٹی کی جانب سے صحافیوں کو دی جانے والی سزاؤں اور خاص طور پر کوڑوں کی سزاؤں کی سختی سے مذمت کرتے ہیں اور اپیل کرتے ہیں کہ عبوری حکومت اس مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرے، انہوں نے صحافیوں کو یقین دلایا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہیں اور بطور دوست اور مسلمان کے اپیل کرتے ہیں کہ کوڑوں کی سزائیں منسوخ کی جائیں انہوں نے کہا کہ پریس ہماری آزادئ رائے کا محافظ ہوتا ہے اور اس قسم کے ہتھکنڈوں سے آزادئ رائے کی جدوجہد کو کچلا نہیں جا سکتا ہے۔

مسٹر فاروق لغاری نے افغانستان کے حالیہ واقعے کے متعلق قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کی جانب سے دیئے گئے بیانات پڑوسی ملک سے خارجہ تعلقات خراب کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے افغانستان کی نئی حکومت کو تسلیم کر کے دانشمندانہ قدم اٹھایا ہے مسٹر فاروق لغاری نے آخر میں کہا ہے کہ پیپلز پارٹی ہر وقت انتخابات کے لئے تیار ہے، اور ہم جیلوں میں رہ کر بھی انتخاب میں حصہ لینے کو تیار ہیں۔

بینظیر بھٹو کی نظربندی میں ایک ماہ کی توسیع

پاکستان کے سابق وزیراعظم کی بیٹی اور پاکستان پیپلز پارٹی کی جواں سال رہنما مس بے نظیر بھٹو ۱۸ر مارچ ۱۹۷۸ء سے تقریباً اسی وقت سے نظر بند ہیں جب سے ان کے والد اور پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ نے پھانسی کی سزا سنائی تھی ۱۸ر مارچ سے ایک ماہ کی نظربندی تھی۔ پھر اس نظربندی میں مزید توسیع کی گئی۔ ۱۸ر اپریل سے ۱۸ر مئی تک۔ ۱۸ر مئی کو نظربندی ختم ہونے والی تھی تو پھر ایک ماہ کی توسیع کر دی گئی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ۱۶ر مئی سے شروع ہونے والے عرصۂ نظربندی کا حکم ۱۵ر اپریل کی تاریخ سے کیوں جاری ہوا ہے جبکہ اے ایس پی کی رپورٹ ۱۴ر مئی کو ملی ہے۔

ڈپٹی کمشنر ساؤتھ کراچی کے حکمنامے کا متن درج ذیل ہے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آفس اور ڈپٹی کمشنر ساؤتھ۔ کراچی۔ ۲

حکم نظربندی زیر دفعہ ۵ بحالی امن عامہ سندھ (آرڈی ننس ۳۱۔ مجریہ ۱۹۶۰ء)

ہرگاہ کہ مس بے نظیر بھٹو کو سید نیر حسنین زیدی اے ایس پی فریئر۔ کراچی کی رپورٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ان کی سرگرمیاں اس طور پر تھیں۔ جو تحفظ عامہ اور بحالی امن عامہ کے لئے مضر ہوتی۔ لیو/ ایس ۵ بحالی امن عامہ (آرڈی ننس ۳۱، مجریہ ۱۹۶۰ء کے تحت ان کے مکان کے احاطے کے اندر قیام کرنے اور رہنے کے لئے محدود کر دیا گیا ہے۔

مزید برآں۔ مذکورہ اے ایس پی فریئر سب ڈویژن نے ایک اور رپورٹ (نمبر اے ایس پی/ فریئر/ ۲۰۹۳ مورخہ ۱۴ر مئی ۱۹۷۸ء) پیش کی ہے جس میں انہوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر انہیں رہا کر دیا گیا تو وہ ایسی حرکتوں میں ملوث ہو جائیں گی۔ جن سے تحفظ و امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

مزید برآں سابقہ رپورٹ کے مطالعہ کے بعد نیز پولیس کی تازہ ترین رپورٹ کے بعد جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ مس بے نظیر بھٹو کو ایسی حرکتوں سے روکنا ضروری ہے۔ جو تحفظ عامہ اور بحالی امن عامہ کے لئے مضر ہوں۔ لہٰذا اب میں ضیاالاسلام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر ساؤتھ کراچی سندھ امن عامہ آرڈی ننس کی دفعہ ۵ کے تحت حاصل شدہ اختیارات سے کام لیتے ہوئے اس کے ذریعہ ہدایت دیتا ہوں کہ تم سید نیر حسنین زیدی اے ایس پی فریئر کراچی یقینی طور پر اس کا خیال رکھو کہ مس بے نظیر بھٹو بنت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ۱۶ر مئی ۱۹۷۸ء سے مزید ۳۰ر دنوں کے لئے اپنے مکان واقع نمبر ۷۰ کلفٹن کراچی ہی کے احاطے میں قیام کرے اور رہے

میرے ہاتھ سے اور عدالت کی مہر سے آج اپریل ۱۹۷۸ء کے ۱۵ویں دن جاری کیا گیا۔

(ضیاء الاسلام)

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر ساؤتھ کراچی

مظفر آباد
جی ایم مفتی

کشمیر کو پاکستان سے الگ کرنے کی امریکی سازش

امریکی پیشکش کو ٹھکرانے کے سلسلے میں سردار عبدالقیوم کی لن ترانی

پاکستان قومی اتحاد کے ایک لیڈر سردار محمد عبدالقیوم خان کے اس انکشاف کے بعد کہ امریکہ نے ۱۹۴۸ء میں ریاست جموں و کشمیر کو آزاد و خود مختار ریاست کے قیام کے لئے اُن کے ساتھ نہ صرف رابطہ قائم کیا تھا بلکہ اس معاملے میں ان کی حمایت حاصل کرنے کی بھی بھرپور کوششیں کی تھیں اور بقول اُن کے انہوں نے اس بڑی عالمی طاقت کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیا تھا۔ آزاد کشمیر کے سیاست دان، قومی کارکن، اخبار نویس اور عام لوگ ششدر رہ گئے ہیں یہ انکشاف انہوں نے ضلع پونچھ میں گذشتہ روز ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ امریکہ کی جنوبی ایشیا کی سیاست میں دلچسپی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر کشمیر کے بارے میں عوام کو آج تک یہی تاثر دیا جاتا رہا ہے کہ امریکہ جمہوری اقدار کا احترام کرتا ہے حق خود ارادیت کی جدوجہد میں مصروف قوموں کی اصولی طور پر حمایت بھی کرتا ہے۔ اس کے باوجود امریکہ آج سے تیس سال قبل ہی کشمیر کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے اور حیران کن بات یہ ہے کہ امریکہ کو سردار قیوم کے سوا سرزمین آزاد کشمیر میں اور کوئی شخص اس مقصد کے لئے نہیں مل سکا۔ جب کہ قائد کشمیر چودھری غلام عباس مرحوم، سردار محمد ابراہیم خان۔ کے۔ایچ خورشید جیسے رہنما بھی اسی ملک میں موجود تھے اور امریکہ جیسی سپر طاقت کو اُن کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا

قارئین کرام کی واقفیت کے لئے کشمیر کے ان رہنماؤں کی سیاسی جدوجہد کے بارے میں ماضی کی طرف جائیں چودھری غلام عباس مرحوم ہمیشہ انگریز اور ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف مصروف جدوجہد رہے کشمیر کی تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں کشمیری عوام کی ترجمانی آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس ہی کرتی رہی جس کے بانی قائدین میں چودھری صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ بلاشبہ کشمیری اس وقت ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ کرتے رہے کیونکہ برطانوی ہند میں ابھی تک اسلامیان ہند کے سامنے کوئی واضح نصب العین یا منزل نہ تھی اور جب ۱۹۴۰ء میں تاریخی قرارداد پاکستان منظور کی گئی تو کشمیری قائدین کے سامنے بھی ایک واضح اور روشن منزل نظر آئی چودھری غلام عباس مرحوم نے اسی وقت پاکستان کو اسلامیان کشمیر کی منزل ٹھہرایا اور اس کے لئے مصروف کار ہو گئے۔ اس مقصد کے لئے حصول کے لئے انہوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر اور بہترین حصہ ڈوگرہ جیلوں میں گذارا۔ مگر تحریک پاکستان سے اُن کی وابستگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور وہ آخر وقت تک اسی اصول پر کاربند رہے۔ ان کی اس جدوجہد میں مرحوم میرواعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ بھی اپنے طور پر کوشاں رہے ۱۹۴۴ء میں جب حضرت قائد اعظمؒ سرینگر تشریف لائے تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں مسلمانان کشمیر کو دو قومی نظریہ اپنانے پر زور دیا حالانکہ نیشنل کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ نے متحدہ ہندوستانی قومیت کو اپنا کر بہت حد تک اپنی مقبولیت کھو دی تھی۔ انہی دنوں میں قائد اعظمؒ کی نظر انتخاب جموں و کشمیر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جوان سال رہنما مسٹر کے۔ایچ خورشید پر پڑی اور وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئے یہ وہ دور تھا کہ برطانیہ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے مضمحل ہو چکا تھا اور ہندوستان کی آزادی کا سوال فیصلہ کن مرحلوں سے گذر رہا تھا مسٹر خورشید ۱۹۴۴ء سے لیکر ۱۹۴۸ء تک حضرت قائد اعظم کے رفیق کار رہے اور انہوں نے تحریک پاکستان کی اصل روح اور اس کے مضمرات کو بہت نزدیک سے دیکھا اور سمجھا ۱۹۴۸ء میں وہ سرینگر گئے جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں سیاسی رہنماؤں کے تبادلے کے سلسلہ میں پاکستان واپس آ گئے۔ اس وقت قائد اعظم

جلد ہی قوم پر اس "مردِ مومن" کی اصلیت بھی ظاہر ہو جائے گی

وفات پا چکے تھے۔

برصغیر میں تحریک آزادی جب فیصلہ کن دور میں پہنچی تو اس وقت آزاد کشمیر کے موجودہ صدر سردار محمد ابراہیم خان ریاست کی اسمبلی میں مسلم کانفرنس کے ڈپٹی لیڈر تھے اور سردار محمد ابراہیم خان کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان ہی کی صدارت اور رہائش گاہ پر سرینگر میں ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو باضابطہ طور پر مسلم کانفرنس نے قرارداد الحاق پاکستان منظور کی جبکہ اس سے قبل چودھری حمیداللہ مرحوم قائم مقام صدر مسلم کانفرنس کی صدارت میں اس جماعت نے خودمختار کشمیر کی قرارداد منظور کی ہوئی تھی اس طرح سے سردار محمد ابراہیم خان تحریک پاکستان سے وابستہ ہو گئے" اور بعد میں یہی سردار ابراہیم خان آزاد کشمیر کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

یہ تاریخی پس منظر اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے۔ کہ اس دور میں ہماری تحریک آزادی کے ساتھ جو رہنما وابستہ تھے اور جن کا اہل کشمیر پر اثر تھا اس سے متعلق آج کے سیاسی کارکنوں، دانشوروں اور رائے عامہ کو آگاہ کیا جائے۔

جہاں تک سردار محمد عبدالقیوم خان کا تعلق ہے اس سارے پس منظر میں ان کا وجود کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے ان کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ کسی عالمی طاقت نے اس وقت معروف سیاسی رہنماؤں کو چھوڑ کر ایک گمنام شخص سے رابطہ قائم کیا ہو البتہ یہ ایک تاریخی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سردار قیوم آزاد کشمیر کی سیاست میں ایک منفی رجحان کی وجہ سے آگے لائے گئے۔ کیونکہ وزارت امور کشمیر کو لڑاؤ اور حکومت کرو کے تحت ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو وقتاً فوقتاً ان کے مقاصد کے لئے کام آ سکے نوکر شاہی نے آزاد کشمیر میں اپنے مخصوص عزائم کو پورا کرنے کے لئے سردار قیوم کو پہلے ایک وزیر کی حیثیت سے آزمایا اور اسی وزارت کے دوران انہوں نے نہ معلوم اشارے پر اقتدار کے لئے مسلح بغاوت کا منصوبہ بنایا مگر یہ سازش قبل از وقت ناکام ہو گئی اور سردار قیوم کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ چند ماہ کے بعد چودھری غلام عباس مرحوم کی سفارش پر انہیں گھر بھیج دیا گیا۔

۱۹۵۱ء میں سردار قیوم نے آزاد پاکستان پارٹی میں شمولیت اختیار کی جس کے کرتا دھرتا "پنڈی سازش کیس" میں ملوث سجاد حیدر وغیرہ تھے۔

پاکستان کے خلاف اس سازش کے طشت از بام ہونے کے بعد سردار قیوم کو گرفتار کیا جانا تھا لیکن پھر چودھری غلام عباس مرحوم آڑے آئے انہوں نے حکومت پاکستان کو یہ باور کرایا کہ چونکہ سردار قیوم آزاد کشمیر کا باشندہ ہے۔ اس لئے اس کی گرفتاری کو بھارت پاکستان کے خلاف استعمال کر سکتا ہے ویسے بھی ان کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ انہیں گرفتار کر کے بلاوجہ الجھن پیدا کی جائے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے مسلم کانفرنس میں پناہ لینے کو ہی عافیت جانا۔ اور جب ۱۹۵۶ء میں کشمیری جماعتوں کے درمیان اتحاد ثلاثہ ہوا تو سردار قیوم کو حکومت آزاد کشمیر کا صدر اور سردار محمد ابراہیم خان کو جماعت کا صدر بنایا گیا۔ لیکن سردار قیوم کو اپنی افتاد طبیعت کی وجہ سے زیادہ دیر تک صدارت راس نہ آئی اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی سے سکندر مرزا کے اشارے پر ٹکراؤ پیدا کیا جس کے نتیجے میں سہروردی مرحوم نے انہیں صدارت سے برطرف کر دیا۔ پھر ایک طویل عرصہ تک سردار قیوم محروم اقتدار رہے اور مسلسل وزارت امور کشمیر سے ساز باز کرنے میں مصروف کار رہے بالآخر ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی کے ایک حامی ریٹائرڈ جنرل شیر علی خان کی وساطت سے آزاد کشمیر کے صدارتی الیکشن میں کامیاب قرار دیئے گئے۔

برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ مقتدر سمجھتے ہوئے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی میں ایک پرائیویٹ بل پیش کر دیا کہ آزاد کشمیر اسمبلی کو قومی اسمبلی کا درجہ دیا جاتا، پاکستان کی قومی اسمبلی کی طرح اس کی میعاد پانچ سال ہو گی اس لئے آزاد کشمیر بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے جس کے صدر وہ خود ہیں۔ یہ اقدام اس وقت کیا گیا جس وقت پاکستان ہولناک ترین جنگ میں اپنی سلامتی کی تگ و دو میں مصروف تھا اور یہ "محب پاکستان" پراسرار طور پر پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پہلے کی طرح ان کی یہ سازش بھی ناکام بنا دی گئی۔ اسی دوران یہ انکشاف ہوا کہ بھارتی انٹیلی جنس کا ایک آفیسر پشپال سنگھ سردار قیوم سے ایوانِ صدر آزاد کشمیر میں کئی بار خفیہ طور پر ملاقاتیں کر چکا ہے جسے انہوں نے حکومتِ پاکستان سے بھی چھپائے رکھا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں برسراقتدار آئے تو سردار قیوم کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا۔ لیکن مسٹر بھٹو قومی معاملات میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ آزاد کشمیر کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ حتیٰ کہ سردار قیوم کی میعاد صدارت نہ صرف پوری ہو گئی بلکہ بھٹو صاحب کی مہربانی سے غیر آئینی طور پر مزید چھ ماہ تک صدارت پر متمکن رہے اس ساڑھے چار سالہ دورِ حکومت میں سردار قیوم اور ان کے لڑکے نے اس قدر بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں کیں کہ آزاد کشمیر کے عوام اس "مرد مومن" سے نالاں ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ سردار قیوم کا سیاسی، ماضی اور حال اس امر کی گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ اپنے اقتدار کے لئے اور سیاسی شعبدہ گری کے ذریعے اپنی بدعنوانیوں کو چھپانے کی خاطر اکثر مختلف اور متضاد بہروپ میں آ کر آزاد کشمیر اور پاکستان کے سادہ لوح عوام کو دھوکا دیتے رہے ہیں ان کے سارے سیاسی کردار پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا۔ کہ ان کی کوئی نظریاتی اساس نہیں کوئی سیاسی فکر نہیں وہ جذبات سے بھرپور مگر عقل سے عاری جوشیلی تقریروں سے اپنی سیاسی حیثیت ایک مجمع باز کی طرح قائم کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ وہ پاکستان کی محبت اور اسلام کی آڑ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو عربوں میں لارنس آف عریبیا نے کیا

تھا۔ وہ جو بات خود کرتے ہیں اس کا الزام بڑی دلیری سے دوسروں پر عائد کرتے ہیں انہوں نے معاہدۂ شملہ کو پڑھے بغیر اس کی زبردست حمایت کی اور وہ ساری قوم میں واحد شخص ہیں جنہوں نے بلا سوچے سمجھے معاہدہ شملہ کی حمایت میں پہل کی اور آج اسی معاہدے شملہ میں انہیں ہلاکت ہی ہلاکت نظر آتی ہے۔

انہوں نے آزاد کشمیر کو پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ میں نمائندگی دینے کے لئے آزاد کشمیر اسمبلی میں ایک خفیہ قرار داد منظور کرائی۔ اس طرح سے آزاد کشمیر کو پاکستان کا پانچواں صوبہ بنانے کی راہ ہموار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اور جب اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو آزاد کشمیر کے دورے پر تشریف لائے تو سردار قیوم نے بحیثیت صدر آزاد کشمیر انہیں عالم اسلام کا بطل جلیل اور آسمانِ سیاست کا چمکتا ہوا ستارہ کہا لیکن آزاد کشمیر کے محبّ وطن عوام اور سیاسی رہنماؤں نے سردار قیوم کی اس سازش کو بھی ناکام بنا دیا لیکن آج سردار قیوم آزاد کشمیر کے عوام کو یہ باور کرانے کی بھونڈی کوشش کر رہے ہیں کہ مسٹر بھٹو آزاد کشمیر کو صوبہ بنانا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے صدارت کی قربانی دے کر اسے ناکام بنایا حالانکہ یہ بات آزاد کشمیر اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے کہ خود سردار قیوم نے ایک مخصوص سیاسی مقصد کے حصول کے لئے جن میں مہاجرین جموں و کشمیر مقیم پاکستان سے جان چھڑانے کے لئے یہ اقدامات کئے تھے۔

گفتار و کردار کے تضادات کا نام "مجاہد اول" سردار عبدالقیوم خان ہے جنہیں ہوسِ اقتدار کی وجہ سے آزاد کشمیر کا خطہ اب تنگ نظر آ رہا ہے اس لئے وہ پاکستان کی سیاست میں پانچویں سوار بنے پھرتے ہیں لیکن جلد یا بدیر قومی اتحاد کے رہنماؤں اور پاکستان کے عوام پر اس "مردِ مومن" کی اصلیت ظاہر ہو جائیگی۔

OO

کوئٹہ سے
چشتی مُجاہد

بزنجو سے 10000 روپے کے تقاوی قرضے کی واپسی کا مطالبہ

بلوچستان کے سیاستدان اور انکم ٹیکس کے محکمے میں ٹھن گئی

سیاسی سرگرمیوں پر پابندی

اگرچہ ہے مگر اس کے باوجود بلوچستان کے میدان سیاست میں جو گہما گہمی نظر آتی ہے گذشتہ ایک سال میں جبکہ سیاسی سرگرمیوں پہ پابندی بھی نہیں تھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ قومی حکومت کے قیام کے لئے بھی کی جانے والی کوششوں کا سب سے زیادہ چرچا بھی بلوچستان میں نظر آتا ہے۔

سیاستدانوں کی سیاست دانوں سے ملاقات کے بعد چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے بلوچستان کے سیاستدانوں کو ملاقات کے لئے اسلام آباد مدعو کیا جن سیاست دانوں کو بات چیت کے لئے مدعو کیا گیا تھا ان میں غوث بخش بزنجو۔ عطاء اللہ مینگل خیر بخش مری۔ محمود اچکزئی۔ میر نبی بخش زہری عثمان جوگیزئی۔ دودا خان۔ تیمور شاہ جوگیزئی اور نواب زادہ شیخ عمر شامل تھے۔ خیر بخش مری اپنی علالت کے سبب اس بات چیت میں شرکت نہ کر سکے۔ خیر بخش مری کا ہرنیا کا آپریشن ہوا ہے اور وہ کوئٹہ کے ایک ہسپتال میں داخل ہیں۔ سردار عطاء اللہ مینگل کو اطلاع نہیں مل سکی۔ جبکہ محمود اچکزئی پی آئی اے کی باکمال پرواز کے باعث وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ ان تمام سیاستدانوں کو گروپوں کی صورت میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کرنی تھی مگر میر غوث بخش بزنجو نے ان سیاستدانوں کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مختلف نظریات کے لوگوں کے ساتھ وہ بیٹھ کر ملاقات نہیں کریں گے جس پر ان کے لئے علیحدہ ملاقات کے لئے انتظام کیا گیا۔ باخبر ذرائع کے مطابق اس ملاقات میں قومی حکومت کے قیام کے علاوہ افغانستان کی صورتحال پر بھی غور کیا گیا۔ مگر غوث بخش بزنجو نے مجوزہ قومی حکومت میں شمولیت سے انکار کر دیا ہے۔ اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو بتا دیا ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی کسی بھی صورت میں مجوزہ حکومت میں شامل نہیں ہوں گے البتہ انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یقین دلایا کہ وہ مجوزہ قومی حکومت کے

قیام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ اور اگر قومی حکومت بن گئی تو وہ اس کی حمایت کریں گے۔ اس ملاقات میں یہ فیصلہ بھی کیا کہ گذشتہ پانچ سال میں فوجی کارروائی کے نتیجہ میں مقامی باشندوں کا جو نقصان ہوا ہے اس کا جائزہ لینے۔ رپورٹ مرتب کرنے اور لوگوں کو مالی امداد دینے کے سلسلہ میں ایک کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا کمیٹی میں دو افراد فوج سے اور دو افراد بلوچستان کے مقامی سیاستدانوں سے لئے جائیں گے مگر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور غوث بخش بزنجو کی یہ ملاقات کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ اور اب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایک ہفتہ کے اندر بلوچستان پہنچ رہے ہیں جہاں بلوچ رہنماؤں سے بات چیت کا ایک اور دور ہوگا۔

اس وقت جب کہ میر غوث بخش بزنجو اسلام آباد میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کر رہے تھے کہ نال میں ان کے گھر کمشنر قلات ڈویژن کی جانب سے ایک نوٹس بھیجا گیا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ آج سے پانچ سال قبل انہوں نے تقاوی قرضہ کے طور پر جو ۵۰ ہزار روپے قرض لئے تھے وہ فوراً واپس کئے جائیں میر غوث بخش بزنجو کے قرضہ کی یہ رقم ایک لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے کیونکہ ان پانچ سالوں میں اس رقم پر سود بھی لگتا رہا ہے مگر باخبر ذرائع کے مطابق میر غوث بخش بزنجو نے رقم کی واپسی پر معذوری ظاہر کی ہے اور کہا ہے کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ یکمشت اتنی زیادہ رقم ادا کر سکیں۔ ایک طرف تو میر غوث بخش بزنجو کو یہ نوٹس ملا ہے مگر دوسری طرف فضیلہ عالیانی کے بھائی چنگیز عالیانی کو جو سرکاری ملازم ہیں دیئے جانے والے چاروں نوٹس واپس لئے جا چکے ہیں جن میں ان پر سنگین بدعنوانیوں کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ سیاسی حلقے ان نوٹسوں کی واپسی اور فضیلہ عالیانی کی پیپلز پارٹی سے علیحدگی کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ادھر کالعدم نیپ کے ایک رہنما اور بلوچستان کے سابق وزیر اطلاعات میر گل خان نصیر نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے اپیل کی ہے کہ ان کے خلاف بلوچستان کی مختلف عدالتوں میں جو مقدمات زیر سماعت ہیں وہ واپس لئے جائیں کیونکہ یہ مقدمات سیاسی مخالفت کی بناء پر سابق حکومت نے قائم کئے تھے اپنی درخواست میں انہوں نے کہا ہے کہ ان کے خلاف سابق حکومت نے جو سیاسی مقدمات قائم کئے تھے وہ واپس لئے جا چکے ہیں لیکن فوجداری مقدمات اب تک عدالتوں میں زیر سماعت ہیں ان پر قتل اور بدعنوانیوں کے مقدمات شامل ہیں۔ قتل کے ایک مقدمے میں گل خان نصیر اور ان کے ساتھیوں پر الزام ہے کہ انہوں نے اپنے دور وزارت میں ایک خاتون بیگم النساء کو قتل کر کے لاش روڈ پر پھینک دیا تھا۔ انہوں نے اپنی درخواست میں کہا ہے کہ یہ مقدمات بلوچستان کے سابق گورنر اکبر بگٹی کے دور میں قائم کئے گئے تھے۔

محکمۂ انکم ٹیکس کہ جس سے فلمی اداکاروں کی ان

قرضے لینے والوں میں قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے کئی ممتاز رہنما شامل ھیں

دلوں جان نکلتی ہے بلوچستان کے ۷۶ سیاستدانوں کو جن میں سابق گورنر۔ وزیر اعلیٰ۔ صوبائی وزراء اور اسمبلی کے ارکان بھی شامل ہیں ان کی جانب سے اثاثوں کے متعلق گوشواروں کی بنیاد پر انکم ٹیکس کے نوٹس جاری کر دیئے ہیں یہ نوٹس انکم ٹیکس ایکٹ کے ضابطہ ۲۲ کی ذیلی دفعہ ۲ کے تحت جاری کئے گئے ہیں اور ان اطلاعات کی بنیاد پر کئے گئے ہیں جو انہوں نے مارشل لاء کے ضابطہ نمبر ۱۲ کے تحت اپنے اثاثے اور آمدنی ظاہر کرنے کے لئے حکومت کو مہیا کی تھی اس اقدام کے نتیجہ میں بیشتر سیاستدانوں کو آمدنی اور دولت کا ٹیکس گذشتہ کئی برسوں کا ادا کرنا ہوگا اور اس جرمانے کی رقم اس کے علاوہ ہوگی سرکاری ذرائع نے بتایا ہے کہ اگر کسی شخص نے مقررہ مدت کے اندر یہ ٹیکس ادا نہیں کیا تو اس کے خلاف مارشل لاء کے ضوابط کے تحت کارروائی بھی ہو سکتی ہے ان نوٹسوں سے حکومت کو ۵۰ لاکھ روپے کی زائد آمدنی ہوگی گذشتہ سال بلوچستان سے محکمۂ انکم ٹیکس نے ایک کروڑ ۶۳ لاکھ روپے ٹیکس وصول کیا تھا جب کہ اس سال یہ آمدنی دو کروڑ روپے تک پہنچنے کی توقع ہے۔ ان ذرائع کے مطابق جن سیاستدانوں کو نوٹس جاری کئے گئے ہیں ان میں خیر بخش مری۔ عطاء اللہ مینگل۔ اکبر بگٹی۔ غوث بخش رئیسانی۔ محمود اچکزئی۔ یوسف مگسی۔ نبی بخش زہری۔ تاج محمد جمالی۔ طارق مگسی۔ ظفر اللہ جمالی فضیلہ عالیانی بیگم زیبا رئیسانی۔ بیگم جینیفر موسیٰ۔ مسز رستم مارکر۔ نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی۔ نوابزادہ شیخ عمر۔ سردار دودا خان زرکزئی۔ سیف اللہ خان پراچہ۔ مولوی صالح محمد۔ مولوی حسن شاہ۔ صابر علی بلوچ۔ قادر بخش بلوچ۔ امان اللہ گچکی۔ نصرت اللہ سنجرانی۔ حاجی محمد زمان اچکزئی۔ میر غوث بخش بزنجو۔ میر گل خان نصیر۔ جام غلام قادر۔ محمد خان باروزئی۔ یحییٰ بختیار۔ طاہر محمد خان۔ احمد نواز بگٹی۔ شاہ نواز خان شاہیانی، ڈاکٹر جعفر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

گذشتہ دنوں خضدار میں طالب علموں کے جلوس پر جو وحشیانہ فائرنگ کی گئی تھی اور جس کے نتیجہ میں ایک نوجوان ہلاک اور پندرہ طالب علم زخمی ہو گئے تھے۔ اس سانحہ کے بعد کرنل اسلم اور ڈپٹی کمشنر خضدار غازی خان ترین پر مشتمل جو تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی ہے۔ سانحہ کی تحقیقات کے دوران ۲۵ سے زائد افراد کے بیانات قلمبند کئے گئے اور کمیٹی کو تحقیقات کے دوران بتایا گیا کہ سانحہ کے دوران کل ۴۳ گولیاں فائر کی گئیں۔ رپورٹ جلد ہی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بلوچستان میجر جنرل غلام محمد کو پیش کر دی جائے گی۔ ویسے میر غوث بخش بزنجو نے سانحہ خضدار کی غیر جانبدار اور عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔

OO

پبلیکیشنز

خط و کتابت کے وقت لفافے پر متعلقہ شعبے کا نام ضرور درج کیجیے

چیف ایڈیٹر

محمود شام

ایگزیکٹو ایڈیٹر

اشرف شاد

شعبہ ادارت

عالمی امور	رفیع احمد فدائی
ملکی امور	مجاہد بریلوی
	شہناز احمد

نمائندے

حیدر آباد	حسن کامران
اسلام آباد	ضمیر نفیس
لاہور	خیکاف
پشاور	ثناء اللہ
مظفر آباد	جی ایم مفتی
ملتان	قسور سعید مرزا
فیصل آباد	خالد عباس سیف
کوئٹہ	چشتی مجاہد

بذریعہ ہوائی ڈاک

پاکستان میں بذریعہ معمولی ڈاک

قیمت فی کاپی ــــــ ۳ روپے

سالانہ	۵۲ شمارے	۱۴۰ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۷۵ روپے

انگلستان، ڈنمارک، ناروے، فرانس، مغربی جرمنی، سویڈن، اٹلی، سوئزرلینڈ، اسپین (یورپ) اور ایشیا میں:- جاپان، ملائیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، چین،

سالانہ	۵۲ شمارے	۳۸۰ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۱۹۵ روپے

ایران، عراق، سعودی عرب، کویت، سری لنکا، نیپال،

سالانہ	۵۲ شمارے	۲۳۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۱۲۳ روپے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا،

سالانہ	۵۲ شمارے	۶۱۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۳۱۵ روپے

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ،

سالانہ	۵۲ شمارے	۵۴۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۲۸۰ روپے

دوبئی، ابوظہبی، افغانستان، بحرین، مسقط، قطر، شارجہ،

سالانہ	۵۲ شمارے	۲۹۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۱۳۸ روپے

دفترِ رابطہ:

معیار پبلیکیشنز، پوسٹ بکس ۳۱۹۵

۱۹۰-سی، بلاک ۲ - پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹

خطوط

اپنا رویّہ درست کریں!

آپ کے رسالے کا نام دیکھ کر ہم نے سمجھا تھا کہ جیسا اس کا نام ہے ویسا ہی اس کا کام بھی ہوگا لیکن نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ پرچہ صرف ایک شخصیت کی پوجا پاٹ اور ایک خاندانی پارٹی کے ترانے گانے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ رسالہ اس قدر غلیظ ذہنیت کا مظاہرہ کرے گا۔ آپ جس پارٹی اور جس شخصیت کے اتنے گن گاتے ہیں اس کی کارگزاریاں اس ملک کے عوام کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پارٹی اور اس شخصیت سے ملک کو نجات نہ دلاتا تو نہیں معلوم آج اس قوم اور اس ملک کا کیا حشر ہوتا۔ پانچ چھ سال کے دورِ اقتدار میں اس شخص نے جو تباہیاں پھیلائیں اگر دوسری مرتبہ اسے اطمینان سے برسراقتدار رہنے دیا جاتا تو شاید پانچ چھ مہینے ہی میں اس قوم کا گلا گھونٹ ڈالتا۔ بہر حال اب آپ یہ سن رکھیں کہ بھٹو کا دور اب دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اسے اپنے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔ لہٰذا اگر آپ میں تھوڑی بھی غیرتِ ایمانی باقی ہے تو اپنا رویّہ درست کرلیں ورنہ جیسی آپ کی مرضی۔

(اس ناصح مشفق مراسلہ نگار نے اس قدر قیمتی مشورہ دینے کے باوجود اپنا نام اور پتا لکھنے کی زحمت نہیں کی)

"صحافت کا معیار"

"معیار" کا شمارہ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۵ تا ۲۲ اپریل دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس میں بھٹو کے قصیدوں، پیپلز پارٹی کی تعریفوں اور مولوی کوثر نیازی کی برائیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا واقعی صحافت کا یہی معیار ہونا چاہئیے اور غیر جانبدار صحافی ایسے ہی ہوتے ہیں ہمارے ملک کی بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ یہاں کے صحافیوں کو حقیقت سے کوئی دل چسپی نہیں بس وہ اپنی پسند کی سیاسی پارٹیوں اور سیاست دانوں کی تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں۔ دنیا جہاں کی ساری خوبیاں بس انکے پسند کے سیاست دانوں کے اندر ہی ہوتی ہیں اور جنہیں وہ پسند نہ کریں۔ ان کے اندر دنیا کی ساری برائیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں یہی اس ملک کی صحافت ہے اور سب سے بڑی بدبختی بھی۔ ایڈیٹر کے صفحے میں کسی محترمہ کے خط کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ نظام مصطفےٰ کے نام پر وطن کی معیشت کو نقصان پہنچایا گیا بجا ارشاد ہے لیکن ذرا یہ بھی فرمائیں کہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک ملکی معیشت کا کیا حال تھا۔ اس زمانے کے سرکاری پروپیگنڈوں کا حوالہ نہ دیجئے بلکہ عوام کی حقیقی معاشی حالت بتایئے۔ "عوامی حکومت" کے دور میں لفظ "غدار" کا استعمال اس انداز سے ہوتا رہا ہے کہ اب اس کی سیاسی ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی ہی بدل گئے ہیں۔

(اے ایس شاہد۔ جگہ کا نام نہیں لکھا)

جیل سے ایک طالب علم کا خط

"جیل سے طالب علم کی فریاد" شائع کرنے پر میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ اب میں حیدر آباد جیل سے منتقل ہو کر سنٹرل جیل کراچی آگیا ہوں اور یہاں آکر اپنی پڑھائی شروع کر دی ہے گرچہ یہاں بھی مجھے تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تاہم بہر صورت میں اپنی تعلیم جاری رکھوں گا اور انشاء اللہ اس سال بی اے کا امتحان دے کر ہی ہوں گا جیل میں رہتے ہوئے بھی میرا یہی عزم ہے۔ میں ۸ سال سے جیل میں ہوں لیکن میرے اس عزم میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ آپ نے میرا خط چھاپ کر میری جو حوصلہ افزائی کی ہے اس کے لئے ہمیشہ آپ کا ممنون ہوں گا امید ہے میری یہ آواز بھی طلبہ برادری تک پہنچا دیں گے اور انہیں اس سے آگاہ کر دیں گے کہ جیل میں نامساعد حالات میں رہتے ہوئے بھی میں کسی طرح تحصیل علم میں لگا ہوا ہوں۔

(طالب علم محمد ارشاد۔ سنٹرل جیل کراچی)

مولانا کوثر نیازی

ملک اس وقت غیر یقینی حالات سے دوچار ہے اس بے یقینی کے عالم میں مولانا کوثر نیازی کا ایک صف کو چھوڑ کر دوسری صف میں جانا درست نہیں کہا جاتا ہے کہ جب کسی عالم کے پیر پھسلتے ہیں تو وہ کسی تخت سے ٹکراتا ہے۔ چڑھتے سورج کا پجاری بننا کوئی نئی بات نہیں۔ مولانا کوثر نیازی کا عمل بھی کوئی نہیں تاہم یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے کردار و عمل پر نظر ثانی کریں تو بہتر ہے۔

(سید عباس حسین گردیزی۔ ملتان شہر)

بھرپور جائزہ

"معیار" کا دم غنیمت ہے کہ وہ صحت مند تنقید کا معیار برقرار رکھتے ہوئے ہے تازہ پرچے میں "صورت حال" اور "احوال واقعی" کے زیر عنوان موجودہ سیاسی صورت حال کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے حالانکہ اس دور میں بیشتر پرچوں نے اپنے آپ کو صرف ماضی کی برائیوں کو کریدنے کے لئے ہی خود کو وقف کر دیا ہے اور اس طرح حال سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔

(عبد اللہ یاس۔ کراچی)

نئے باب کا اضافہ

اس پر آشوب دور میں جب کہ صحافیوں کو الٹا لٹکانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ معیار جیسے بیباک صحافت کے علمبردار کو جاری رکھنا صحافت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے اس قسم کی صحافت کی داغ بیل اگر پہلے ہی پڑ چکی ہوتی تو آج ملک پر ان حالات کی حکمرانی نہ ہوتی۔ جن کی آج ہے۔ بہر حال شام صاحب سچائی کے جس ہراول دستے کی قیادت آپ نے سنبھالی ہے۔ اس میں ہم آپ کے ساتھ ہیں انشاء اللہ سچائی کا بول بالا ہوگا۔

(محمد خان شنواری۔ کراچی)

صورتِ حال
محمود شام

نئے حالات میں

پاکستان کو پھر امریکہ کا طفیلی بنانے کی سازشیں

افغانستان میں انقلاب اگرچہ وہاں کا داخلی مسئلہ ہے۔ لیکن صورتحال میں اس تبدیلی نے جنوبی ایشیا میں تبدیلیوں کی رفتار بہت تیز کر دی ہے۔ سفارتی سطح پر نقل وحرکت میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے مشیر امور خارجہ آغا شاہی کا ایران کا دورہ، شہنشاہ ایران اور دوسرے ایرانی رہنماؤں سے مذاکرات، کئی ہزار میل دور سے دنیا بھر کے انقلابیوں کے حامی لیبیا سے وزیر خارجہ طریقی کا ایک اہم وفد سمیت اسلام آباد میں رکتے ہوئے کابل میں کئی روز قیام کے لئے پہنچنا انتہائی اہم اور معنی خیز سفر ہیں، خاموش سفارتی سرگرمیاں اس سے الگ ہیں۔

پاکستان کے نئے سربراہِ حکومت اور افغانستان کے سابق سربراہ مرحوم سردار داؤد کی آپس میں ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں اور کافی حد تک باہمی تعلقات پر مفاہمت بھی ہو گئی تھی۔ اب اس اچانک تبدیلی سے ایک مختلف صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ اب جب تک جنرل ضیاء اور افغانستان کے نئے حکمراں نور محمد ترہ کی کے درمیان بالمشافہ بات چیت نہ ہو، اس وقت تک دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے، افغانستان چھوٹا اور بے سمندر ملک سہی مگر روس کے ساتھ ملحق ہونے کے باعث اس کی بڑی اہمیت ہے، افغانستان کے راستے گرم سمندروں تک پہنچنا روس کی صدیوں کی خواہش رہی ہے۔ افغانستان میں روس نے کافی سرمایہ کاری کی ہے، سردار داؤد جو خود ماسکو نواز تھے وہ بتدریج مغربی بلاک کی طرف رخ موڑ رہے تھے، لیکن اگر وہ اپنے عوام کی ترقی کے لئے بھی کچھ کر رہے ہوتے تو شاید یہ صورتحال اتنی جلد رونما نہ ہوتی۔ امریکہ اور مغربی ممالک پر بھروسہ کرنے والے حکمراں عام طور پر اپنے عوام کی بھلائی اور ترقی کے لئے اتنے فکرمند نہیں ہوتے انہیں قرضے، امداد بہت ملتی ہے، لیکن وہ صرف بڑے بڑے شہروں تک محدود رہتی ہے۔

افغانستان کے واقعات پر تشویش ظاہر کرنے کی بجائے پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو حالات کا ٹھوس تجزیہ کرنا چاہیئے تھا کہ وہاں نوبت یہاں تک کیوں پہنچی۔ اور کیا اس انقلاب کو عوام کی حمایت حاصل ہے یا نہیں جن اسباب و واقعات کی بنا پر افغانستان میں یہ خونیں انقلاب آیا، کیا ہمارے ہاں ان اسباب میں سے تو کوئی موجود نہیں ہے، ہمارے رہنماؤں بالخصوص مفتی محمود نے اس پر جو رویہ اختیار اختیار کیا، وہ اتنا غیر ذمہ دارانہ تھا کہ افغانستان کے ناظم الامور کو اس پر زبان کھولنا پڑی۔

ایسا لگتا ہے کہ افغانستان کے حالات سے سبق حاصل کرنے کی بجائے پاکستان میں ایک مخصوص مکتب فکر جو اکثر و بیشتر پاکستان کے قیام کی دشمن جماعتوں پر مشتمل ہے، اس کی کوشش ہے کہ کسی طرح روس سے پاکستان کے تعلقات خراب ہو جائیں، افغانستان کے معاملات پر غیر ذمہ دارانہ اور بلاجواز بیانات روس کے خلاف معاندانہ اظہار رائے اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ قومی اتحاد کے حامی جرائد اس میں جان بوجھ کر ایک منظم منصوبے کے تحت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ حال ہی میں لاہور کے ایک ہفتہ وار نے روسی سفیر سے منسوب کر کے ایسی باتیں کہیں، جو کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سفارتکار بھی نہیں کہہ سکتا۔ روسی سفارت خانے نے اس انٹرویو کو جھوٹ، بے بنیاد اور افسانوی قرار دیا ہے ایک اور ہفتہ وار نے جسے خود ساختہ "مفکر اسلام" کے بیٹے فاروق مودودی، "پس پردہ" کے نام سے نکال رہے ہیں انہوں نے کوٹ لکھپت جیل سے مسٹر بھٹو کے اغوا کے لئے ایک بڑی عالمی طاقت کے منصوبے کا ذکر کیا ہے یہ بڑی عالمی طاقت نہ امریکہ ہو سکتا ہے نہ چین، ظاہر ہے کہ یہ بھی روس ہی ہے۔ اس نام نہاد منصوبے اور روسی سفیر کے نام نہاد انٹرویو کو کل تحریک پاکستان کی ترجمان اور آج کل قیام پاکستان کے دشمنوں کے ترجمان لاہور کے ایک روزنامے نے بڑی فتنہ سرخیوں کے ساتھ نقل کیا، اس سے پہلے بھی قومی اتحاد کے حامی اخبارات و رسائل روس پر الزام لگاتے رہے ہیں کہ وہ پیپلز پارٹی کو مالی امداد دے رہا ہے، ان تمام کوششوں کا کیا مقصد کہ ایک طرف روس پاکستان کے خلاف ہو جائے اور کوئی ایسا قدم اٹھائے، جس کے بعد یہ سب کہہ سکیں کہ ہم تو پہلے ہی روس کو پاکستان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ پاکستان کے سادہ لوح عوام کو روس سے اتنا خوفزدہ کر دیا جائے کہ عوام پاکستان کے سنٹو میں سرگرم ہونے امریکہ کی گود میں گر جانے میں ہی اپنی بقا سمجھنے لگیں۔

اس حکمتِ عملی کی روشنی میں عوام کی طرف سے مسترد شدہ قومی اتحاد کے مقدر رہنماؤں اور انکے حامی اور آج کل حکومت کے اشتہارات میں نہائے ہوئے اخبارات و رسائل کی روس کے خلاف مہم کا جائزہ لیں۔ جس کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی جا رہی ہے۔ حالانکہ کسی بھی دوست ملک کے خلاف نفرت پھیلانا خارجہ پالیسی کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ اب پتہ نہیں ہمارا محکمۂ خارجہ روس کو دوست سمجھتا ہے یا نہیں۔

حالات جس موڑ پہ پہنچ چکے ہیں، وہاں انتہائی سنجیدگی حقیقت پسندی، جذباتیت سے ہٹ کر اور خالص پاکستانی نقطہ نظر سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہمارے مسائل سنٹو کی گود میں چلے جانے سے حل ہو جائیں گے اور امریکہ اگر اپنی سرد مہری ختم کر کے کچھ قرض اور امداد دیتا بھی ہے تو کیا اسکے ساتھ لگنے والی شرائط کے ہم متحمل ہو سکیں گے اور بدلی ہوئی صورت حال میں ہم ایک دور افتادہ عالمی طاقت کے طفیلی بن کر جنوبی ایشیا میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں پہلے اپنے مسائل کی بساط پھیلانی چاہیئے، کیا یہ مسائل صرف امریکی امداد سے حل ہو جائیں گے اور امریکی امداد حسب معمول اپنے ساتھ اپنی شرائط نہیں لائے گی، اور اس علاقے میں جہاں امریکہ کے خلاف بہت نفرت ہے، وہاں ایک امریکی اثر کا ملک بن کر رہنا کیا ہمسایوں کو مشتعل کرنے کے مترادف اور ان سے الگ تھلگ ہو کر رہنے کی خواہش نہیں ہے۔

ملک میں اندرونی طور پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ اطمینان بخش نہیں ہے، صحافیوں میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ مزدوروں میں بے اطمینانی ہے۔ عام لوگ آٹے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ سیمنٹ پہلی بار راشن کارڈوں پر مل رہا ہے، ابھی گھی کی قلت کا مسئلہ کھڑا ہونے والا ہے۔

اس صورت حال کا تقاضا کیا ہے، بھٹو

باقی صفحہ ۳۸ پر

برطانوی وزیر خارجہ کا بیان اور اُس کے مضمرات

ایک سفارتی مبصر کے قلم سے

اپریل میں ہونے والے سنٹو کے ۲۵ ویں وزارتی اجلاس کے بعد برطانوی وزیر خارجہ ڈاکٹر اوون نے سنٹو کی تنظیم کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ہیں اس سے سنٹو کی فی زمانہ افادیت کا احساس ہوتا ہے اور برطانیہ کی سفارتی اہمیت بھی منکشف ہوتی ہے۔ انہوں نے سنٹو کی تنظیم کو برطانیہ کے لئے انتہائی قدر و قیمت کا حامل قرار دیا۔

انہوں نے اس کے کارناموں میں ایک تو وسطی ایشیا میں استحکام کا قیام شمار کیا، دوسرے امریکہ۔ ترک تعلقات میں سنگین کشیدگی کو روکنا۔ تیسرے جو پاکستان کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کو مغرب کی طرف سے مزید کٹ جانے سے روکنا مزید فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سنٹو نہ ہوتا تو برطانیہ ایران کو اسلحہ کی فراہمی کے سب سے بڑے ذریعہ کی حیثیت حاصل نہ کر سکتا۔ اس سے ہماری خوشحالی بھی متاثر ہوتی۔ انہوں نے کہا کہ سنٹو کے سیکرٹریٹ میں زیادہ بیوروکریسی اور ملازمین نہیں ہیں اس لئے حکومت پر اس کا بوجھ نہیں پڑتا ہے۔ ان کے نزدیک اب سنٹو پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔

سنٹو کے سیکرٹری جنرل مسٹر کامران گورون نے بتایا کہ پاکستان کے جنرل ضیاء الحق کے بعض بیانات کے باوجود پاکستان سنٹو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ مسئلہ میٹنگ میں زیر بحث نہیں آیا اور نہ ہی پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت کے مسئلے پر بات ہوئی ہے۔

اس سے قطع نظر کہ سنٹو سے پاکستان کی وابستگی ختم کرنے کے لئے پاکستان کی ترقی پسند قوتیں ہمیشہ زور دیتی رہی ہیں۔ برطانوی وزیر خارجہ کے ریمارکس کی روشنی میں سنٹو کی افادیت کا تجزیہ کریں تو معنی خیز حقائق سامنے آئیں گے وسطی ایشیا میں استحکام برقرار رکھنے کی توضیح درکار ہے۔ یہ استحکام متعلقہ ملکوں کے آئینی اور جمہوری اداروں اور حقوق کے حصول اور ان کی آزادانہ رائے کے ذریعے برقرار رکھا جا رہا ہے یا ہتھیاروں کی قوت کے ذریعے۔ قبرستان کا استحکام۔ زندہ اور متحرک لوگوں کا قائم کردہ استحکام نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات کہ ہتھیاروں کی تجارت کرنے والوں ہتھیاروں کی زبان میں گفتگو کرنے والوں کے لئے استحکام کے معانی کچھ اور ہوں۔

ایک حیران کن بات یہ ہے کہ وسطی ایشیا جس علاقے کو کہا جاتا ہے، اس کا کوئی ملک سنٹو کا رکن نہیں ہے۔ وسطی ایشیا، سوویت یونین کی وسطی ایشیائی جمہوریتوں پر مشتمل ہے۔ یہاں استحکام کا قیام۔ سنٹو کی ذمہ داری کیسے بن گیا۔

اس طرح امریکہ ترک تعلقات کو کشیدہ ہونے سے روکنا سنٹو کا کارنامہ کیسے ہو گیا کیونکہ امور خارجہ کے تمام ماہرین جانتے ہیں کہ دو ملکوں کے درمیان تعلقات دونوں ملکوں کے دو طرفہ تعلقات کی بنیاد پر خراب یا خوشگوار رہتے ہیں۔ امریکہ ترکی کے درمیان ناٹو کا معاہدہ بھی موجود ہے۔ سنٹو جیسے بے اثر اور کمزور معاہدے کے سر اس امر کا سہرا باندھنا خود فریبی ہے۔

باقی صفحہ ۴۲ پر

صحافیوں اور اخباری کارکنوں کی ایک اور تاریخ ساز جدوجہد

قید، سزائیں، صوبہ بدری، زباں بندی

ایک ہزار بیروزگار، ستّر گرفتار، آٹھ صوبہ بدر، چار پرچے بند!

"کیونکہ حکومت سندھ کی نظر میں پی ایف یو جے اور ایپنک کے صدر مسٹر منہاج برنا کو عوام اور امن عامہ کے خلاف سرگرمیوں سے روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انکے طرز عمل کو ٹھیک کیا جائے۔ لہٰذا حکومت سندھ سندھ مین ٹیننس آف پبلک آرڈر آرڈی ننس مجریہ ۱۹۶۰ء کی دفعہ ۵ ذیلی دفعہ 'د' کے تحت "مسرت کے ساتھ" مذکورہ مسٹر منہاج برنا کو یہ ہدایت دیتی ہے کہ وہ حکومت اور پریس کے تعلقات اور پریس قوانین کے بارے میں ایک ماہ تک نہ کوئی تقریر کرینگے نہ کوئی بیان یا انٹرویو دیں گے۔ اس حکم کا اطلاق فوری طور پر ہوگا۔"

سیکرٹری داخلہ سندھ جناب کنور ادریس کا یہ حکم نامہ جناب منہاج برنا کو ۱۰ مئی کی رات کو دو بجے گھر پر موصول ہوا اور اسی روز مساوات کراچی کی اشاعت بھی منقطع کردی گئی۔ اس روز لاہور میں صحافیوں کی ملک گیر تحریک میں بھوک ہڑتال کرنے کے بعد گرفتار ہونے والوں کی تعداد ابھی ۶۲ تک پہنچ گئی ہے، یہ آزادیٔ صحافت کے اس مثالی دور کا اس وقت تک اسکور ہے جب کہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں۔

صحافیوں کے پابند سلاسل ہونے، پنجاب بدر کیے جانے، زباں بندی عائد کیے جانے اور مساوات لاہور، ہفت روزہ الفتح اور ہفت روزہ معیار کے بعد مساوات کراچی بند ہونے کے باوجود صحافیوں کی یہ تاریخ ساز جدوجہد اسی جوش وجذبہ سے جاری ہے جو ماضی میں بھی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ وہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں سجائے فوجی عدالت کے روبرو پیش ہوکر سزاؤں کے تمغے حاصل کرکے جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں کو اپنی جرأتوں کا سنگ میل بنارہے ہیں

پی ایف یو جے کی یہ جدوجہد اب اس کی روایت بن گئی ہے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۴ء کے بعد ۱۹۷۸ء اس کی جدوجہد کے تین نمایاں سنگ میل ہیں، جن میں اس نے تین مختلف حکمرانوں سے

نبرد آزمائی کا مزا چکھا ہے، اور اس سے پہلے بھی مختلف اقسام کے جو حکمراں آئے اور چلے گئے۔ انہیں اپنے جابرانہ قوانین کے خلاف پی ایف یو جے کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہر دور میں ایک بات بہت واضح طور پر سامنے آئی کہ وہ صحافی جنہوں نے اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لئے جماعت اسلامی جیسی جماعتوں کی پشت پناہی پر صحافت کا چولا پہنا انہوں نے صحافیوں کی اصولی جدوجہد کو غیر اسلامی قرار دے کر ہمیشہ اس کی پشت میں خنجر گھونپا اور اس کے بعد لوبان کے دھوئیں میں کامیابی کا جشن منایا۔ ۱۹۷۰ء میں جب یحییٰ خاں کی فوجی آمریت میں پی ایف یو جے کی سرکردگی میں ملک بھر کے صحافی اور اخباری کارکن اپنے معاشی مطالبات کے لئے ہڑتال پر تھے تو انہوں نے ہڑتال توڑ کر اپنے چہروں پر غداری کی کالک ملی اور اپنے دو سو ساتھیوں کو بے روزگار کیا۔ اور اسے "اسلام کی فتح" سے تعبیر کر کے انتظامیہ کی گودوں میں پھدکتے رہے۔ بعد میں یہ لوگ معافیاں مانگ کر دوبارہ آنکھ ملانے کے قابل ہوئے۔ تو اب انہیں پھر یہ جدوجہد غیر اسلامی نظر آتی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں بھٹو صاحب کی حکومت کے دور میں جب صحافیوں کے جیل جانے کی تحریک زوروں پر تھی تو یہ اس وقت کی حکومت کے وزیر اطلاعات کی گود میں بیٹھے ہوئے اس وقت بھی اسی قسم کا راگ الاپ کر "سرکار" کو خوش کرنے میں مصروف تھے۔ ان سب کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کے گھناؤنے اور مکروہ چہرے دیکھتے ہوئے بھی انہیں کہیں پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور صحافیوں کی انجمنوں میں جب بھی یہ نقابیں بدل بدل کر آئے عبرتناک شکست ان کا مقدر بنی۔

آج سرکار کے پھر یہی لوگ مشیر ہیں جس کے نتیجے میں مساوات کراچی، لاہور اور الفتح اور معیار کی بحالی اور ایڈیٹروں کی رہائی کے لئے لاہور میں جو جنگ لڑی جا رہی ہے وہ گیارہ روز پورے کرنے کے بعد ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے جب کہ حکومت اور پوری صحافی برادری ایک دوسرے سے اور دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ صورت حال صرف اس وقت کی حکومت کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری قوم کے لئے انتہائی خطرناک بن گئی ہے۔ اس عرصہ میں یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ قید اور سزائیں، صوبہ بدری یا زبان بندی اس تحریک کا دم خم توڑنے کے بجائے اسے اور مہمیز دے رہی ہے۔ پھر یہ تحریک مساوات لاہور کی بحالی شروع ہوئی تھی لیکن اس دوران الفتح، معیار اور مساوات کراچی بند ہونے کے بعد اس کا دائرہ اور وسیع ہو گیا ہے۔ معاشی قتل عام کا شکار ہونے والوں کی تعداد چار سو سے بڑھ کر ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

ایک ہزار بے روزگاروں کو اس معاشی قتل عام سے بچانے کے لئے دوسرے اداروں میں کام کرنے والے ان کے بھائیوں کا عزم اور پختہ ہو گیا ہے راولپنڈی، ملتان، کراچی، پشاور، حیدر آباد، نواب شاہ، بدین اور دوسرے شہروں سے لاہور پہنچنے والے دستے اس کا ایک بڑا ثبوت ہیں اس کے باوجود حکومت اور اس کے اہلکار آخر کیا سوچ رہے ہیں اور وہ اسے کس انتہا تک پہنچانا چاہتے ہیں؟ ۔ شاید انہیں سابقہ تجربوں نے یہ نہیں بتایا کہ صحافیوں، اخباری کارکنوں اور ان کی تنظیموں کا معاملہ موقع پرست سیاسی تنظیموں سے بالکل مختلف ہے، وہ جب کسی اصولی جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں تو اس کے لئے ہر انتہا تک جانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ آج بھی وہ اس انتہا تک جانے کے لئے تیار ہیں جہاں تک وہ لے جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ محنت کش طبقے کی طرح ان کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں اور پانے کے لئے بہت کچھ ہے۔ ان کی قربانیاں کم از کم تاریخ میں اپنے نذرانے کے طور پر ایک باب تو رقم کر جائیں گی

○○

لاہور

ایم احمد کی رپورٹ

کہتے ہیں کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ قانون گدھے اور گھوڑے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے، سمجھدار لوگ جانتے ہیں کہ قانون کی نظر میں برابری کا یہ مضحکہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا، قانون انصاف کے لئے بنایا جاتا ہے، اور انصاف گدھے اور گھوڑے میں تمیز سکھاتا ہے۔

اس کا ذکر اس ضمن میں آیا کہ، رہی ۷ مئی کو لاہور شہر میں سابق برطانوی سفارت خانے کی عمارت میں لوگوں نے دو افراد کو ایک ہی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے دیکھا ان میں ایک تو صحافی تھا اور اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے روزگار کی بحالی اور آزادیٔ صحافت کے لئے احتجاج کے طور پر اڑتالیس گھنٹے تک بھوکا رہنے کا ارادہ کیا، اور یوں حکومت کی نظر میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے امن عامہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ دوسرا شخص چرس بیچتا ہوا پایا گیا، اور یوں سماج دشمن ٹھہرا۔ ان دونوں کو فوجی عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لایا گیا تھا۔ فوجی عدالت نے دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا سنائی۔ ۔ صحافی کا نام خالد احمد تھا اور دوسرے شخص کا ثنی، ہتھکڑی کے ایک حلقے میں صحافی کا بایاں بازو تھا تو دوسرے میں ثنی کا دایاں بازو۔ دونوں کو ایک ہی گاڑی میں بٹھا کر جیل بھیج دیا گیا۔ اور وہاں بھی ایک ہی کمرے میں رکھا گیا۔ ۔ ۔ قانون زندہ باد انصاف زندہ باد۔

اس دن صرف خالد احمد کو ہی نہیں بلکہ مزید بارہ صحافیوں کو جن کا تعلق مختلف اخباروں سے تھا، فوجی عدالت نے چھ چھ ماہ قید با مشقت اور پانچ پانچ ہزار روپے جرمانے کی سزائیں۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سیکرٹری جنرل جناب نثار عثمانی

تین تین، چار چار صحافی، ایک ہی زنجیر میں

کا جرم البتہ جرس فروشی سے زیادہ گھناؤنا سمجھا گیا اور انہیں ایک سال قید بامشقت اور دس ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ د جرمانے کی عدم ادائگی کی صورت میں پانچ ہزار والے کو مزید تین مہینے اور دس ہزار والے کو مزید چھ مہینے قید کاٹنا ہوگی۔ جیسا کہ پہلی مثال سے ظاہر ہے انصاف تو مثالی تھا کہ اس نے سب سے برابر کا سلوک کیا۔ لیکن صحافیوں نے اس انصاف کو پسند نہیں کیا۔ اور عدالت کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اس کی بہت سی وجوہات بھی تھیں، جائز یا ناجائز اس کا فیصلہ پڑھنے والے خود کریں گے۔ بیان کے مطابق پہلی بات تو یہ کہ سماعت کی تاریخ ۹ مئی مقرر کی گئی تھی لیکن اس سے دو دن قبل صحافیوں کو اچانک طلب کر لیا گیا۔ اس اچانک میں انہیں بمشکل کپڑے بدلنے کا موقع ملا، کجا یہ کہ وہ کسی وکیل سے مشورہ کر سکتے گواہوں پر نہ تو بھرپور جرح کرنے کا موقع دیا گیا اور نہ ہی گواہوں کے بیانات کی نقول فراہم کی گئیں، اس پر طرہ یہ کہ جب نثار عثمانی اپنا بیان قلمبند کرانے لگے تو ان کا بیان ریکارڈ کرنے سے انکار کر دیا گیا، اور کہا گیا کہ عدالت یہ بیان صرف سننے پر اکتفا کرے گی۔

جناب نثار عثمانی عدالت کی توجہ اس بات کی جانب بھی دلائی کہ عدالت کی طرف سے گواہوں سے جو سوال پوچھے گئے، ان میں استغاثہ کی امداد کا پہلو جھلکتا تھا حالانکہ عدالت کو دونوں فریقوں سے برابر کا سلوک کرنا چاہیئے، اس پر انہیں جواب ملا کہ عدالت کا کام صفائی پیش کرنے میں مدد دینا نہیں ہوتا البتہ عدالت ایسے سوال پوچھ سکتی ہے جس سے استغاثے کو مدد ملے۔ انصاف کا یہ نیا انداز عثمانی صاحب کے لئے حیران کن تھا، چنانچہ انہوں نے معذرت کی اور بیان دیئے بغیر باہر آگئے۔

آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائز کنفیڈریشن کے سیکرٹری جنرل جناب حفیظ راقب کو بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ بھی بائیکاٹ کا اعلان کر کے واپس آ گئے۔ باقی صحافیوں اور اخباری کارکنوں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ ایک ایسے مقدمے کی سماعت میں جس میں ملزموں کی تعداد پندرہ اور گواہوں کی تعداد چار تھی صرف آٹھ گھنٹے لگے، تین تین چار صحافیوں کو ایک ہی زنجیر کی ہتھکڑیوں سے باندھ کر لایا گیا تھا، دوپہر کے کھانے کے وقت بھی ان کی ہتھکڑیاں نہیں کھولی گئیں، چنانچہ ان میں سے آدھوں کو بائیں ہاتھ سے کھانا پڑا۔

گذشتہ تیس سال کے دوران پاکستان میں مختلف قسم کی حکومتیں آئیں فوجی بھی اور سیاسی بھی۔ ہر حکومت نے آزادی صحافت کو اپنے مفاد کے منافی سمجھا، اور ہر حکومت کے خلاف صحافیوں نے تحریکیں چلائیں۔ لیکن پاکستان کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ صحافیوں کو اس قدر سخت سزائیں دی گئی ہیں۔ ۱۴ صحافیوں کو سزائیں سنائی جا چکی ہیں، یہ رپورٹ شائع ہونے تک مزید کئی اور کو سنائی جا چکی ہوں گی،

مساوات کراچی

بند کرنے سے جد و جہد کا

دائرہ اور وسیع ہوجائے گا

بھوک ہڑتال پروگرام کے مطابق جاری ہے اور پورے جوش و خروش و عزم و حوصلے سے جاری ہے۔ ان سزاؤں سے ایک طرف اخباری کارکنوں کا جوش و خروش بڑھا ہے تو دوسری طرف مساوات کے سامنے پولیس کی نفری میں اچانک اضافہ ہو گیا، بھوک ہڑتال کے وقت مساوات کے گرد آدھے آدھے میل کے فاصلے تک پولیس ہی پولیس دکھائی دیتی ہے۔ اور نہ صرف دکھائی دیتی ہے بلکہ پریشان دکھائی دیتی ہے۔ اس حد تک پریشان کہ بھوک ہڑتال کرنے والوں کو ہار پہنانے کے لئے آنے والی، خاتون صحافیوں اور گرفتار ہونے والے صحافیوں کی ماؤں، بہنوں، اور بہو بیٹیوں سے بھی خوفزدہ ہے چنانچہ انہیں بھی ہراساں کرنے کی سعی میں گھنٹوں گھنٹوں محبوس رکھا جاتا ہے۔ ڈنڈے کے زور سے اصولوں پر مبنی تحریک کو دبانے کی ان مجنونانہ کوششوں کو اسلام پسندوں درا صل اسلام دشمنوں) کی پوری پوری حمایت حاصل ہے، رجعت پسندوں کا ترجمان اخبار جس نے اپنے ماتھے پر لیبل لگایا ہوا ہے کہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے، نہ صرف چھپے دارا دار یوں کے ذریعے، صحافیوں کی ملک گیر تنظیم اور اس کے صدر کو کمیونسٹ قرار دیتے ہوئے اور بھی سخت کارروائی کے مشورے دے رہا ہے بلکہ اپنے 'ہم نوالہ' معاصرین کے افکار سے بھی عوام اور حکومت کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ غالباً یہ اسی قسم کا جہاد ہے جس کے زور پر اخبار کے مالک نے لاکھوں روپے کی جائیداد بنالی ہے۔ کئی منزلہ عمارت کی سب سے اونچی منزل پر بیٹھ کر اداریہ لکھنے والوں کو اپنا حق مانگنے والے کمیونسٹ نظر نہیں آئیں گے تو کیا جابر سلطان نظر آئیں گے؟

OO

فوجی عدالت سے سزا یافتہ اخباری کارکن

۱۔ نثار عثمانی سیکرٹری جنرل پی ایف یو جے ایک سال قید بامشقت دس ہزار روپے جرمانہ۔

۲۔ حفیظ راقب۔ سیکرٹری جنرل ایپنک۔ ایک سال قید بامشقت دس ہزار روپے جرمانہ۔

۳۔ احسان اللہ خان حیات لاہور چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ۔

۴۔ مشتاق احمد مساوات لاہور۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۵۔ شریف شیوہ مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۶۔ سلیم اختر مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۷۔ رحیم بخش جتوئی امروز ملتان چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۸۔ پرویز اقبال حیات لاہور چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۹۔ یعقوب چوہدری مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۱۰۔ یونس بٹ مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۱۱۔ سلیم شاہ مساوات لاہور۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۱۲۔ محمد الیاس مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت ایک ہزار روپے جرمانہ۔

۱۳۔ سکندر ملک مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت ایک ہزار روپے جرمانہ

۱۴۔ احمد خالد مساوات لاہور۔ چھ ماہ قید بامشقت ایک ہزار روپے جرمانہ۔

۱۵۔ اسلم شیخ پاکستان ٹائمز لاہور چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۱۶۔ شفقت تنویر مرزا امروز لاہور چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ۔

۱۷۔ محمد افضل اے۔ پی۔ پی ملتان چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۱۸۔ علی احمد خان سن کراچی چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۱۹۔ حشمت وفا امروز ملتان چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۲۰۔ صبیح الدین غوثی پی پی آئی کراچی چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۲۱۔ ضیاء الرحمان پاکستان ٹائمز راولپنڈی۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۲۲۔ عاطف شیخ مساوات کراچی۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۲۳۔ نسیم انور پاکستان ٹائمز راولپنڈی چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۲۴۔ طاہر اسدی مساوات لاہور۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۲۵۔ شیر افگن مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۲۶۔ عبدالحفیظ خان ملت کراچی۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۲۷۔ محمد اقبال حیات لاہور۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۲۸۔ حبیب الرحمان پاکستان ٹائمز راولپنڈی۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۲۹۔ خالد سعید مشرق کراچی۔ چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ۔

۳۰۔ محمد صادق مساوات لاہور تین ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

پنجاب بدر کئے جانے والے صحافی اور کارکن

۱۔ منہاج برنا چیئرمین ایپنک اور صدر پی ایف یو جے۔

۲۔ احفاظ الرحمان سیکرٹری جنرل کراچی یونین آف جرنلسٹس

۳۔ عرس ملاح۔ ہلال پاکستان کراچی

۴۔ وہاب صدیقی مدیر۔ الفتح

۵۔ جوہر میر سابق صدر خیبر یونین آف جرنلسٹس۔

۶۔ زاہد سمعون۔ عبرت حیدرآباد

۷۔ محمد ریاض ہیرالڈ ورکرز یونین کراچی۔

۸۔ عبدالغنی درس۔ عبرت حیدرآباد

گرفتار شدہ صحافی اور اخباری کارکن جن کے مقدمے زیر سماعت ہیں

۱۔ فتح بھائی میمن ہیرالڈ ورکرز یونین کراچی۔

۲۔ اقبال جعفری سن کراچی

۳۔ خاور نعیم ہاشمی مساوات۔ لاہور۔

۴۔ ناصر زیدی نوائے ملتان

۵۔ محمد الیاس پاکستان ٹائمز راولپنڈی۔

۶۔ صغیر الدین پاکستان ٹائمز لاہور

۷۔ رانا نیر اقبال مساوات لاہور

۸۔ محمد اشرف علی روزنامہ صداقت

۹۔ اچھی میمن کسبانی۔ مساوات کراچی۔

۱۰۔ اعجاز محمود مساوات لاہور

۱۱۔ محمد اشرف مساوات کراچی۔

۱۲۔ محمد ارشد خان مساوات لاہور

۱۳۔ عزیز صدیقی پاکستان ٹائمز لاہور

۱۴۔ سلیم عاصمی ایپنک

۱۵۔ سلیم شاہد ״

۱۶۔ محمد خان سن ورکرز یونین کراچی۔

۱۷۔ احسان الحق مساوات لاہور۔

۱۸۔ محمد خالد مساوات لاہور۔

۱۹۔ عبدالحمید مساوات لاہور۔

۲۰۔ عبدالحمید چھاپا جنگ کراچی

۲۱۔ خواجہ نثار جنگ کراچی

۲۲۔ مسعود اللہ خان پاکستان ٹائمز

۲۳۔ ایس ایم صوفی مساوات لاہور

OG

آئینہ

جنرل

بہتر حکمراں، منتظم، سفارت کار اور مدبر ہوتے ہیں

ممتاز اخبار نویس
ایچ ' کے ' برکی
کا خصوصی مضمون

ڈیورنڈ لائن تسلیم نہ ہوئی، ولی خان رہا ہو گئے

ایک ریٹائرڈ جرنیل اور الیکشن سیل کے ایک رکن راؤ فرمان علی نے حال ہی میں ایک نظریہ پیش کیا ہے کہ جب برسر اقتدار جنرلوں کا سیاستدانوں سے واسطہ پڑتا ہے تو ان پر یہ آشکارا ہوتا ہے، کہ سیاستدان بہت ہی بودے لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے جنرلوں کو مشورہ دیا ہے کہ فوج کو کاروبار حکومت میں براہ راست الجھائے رکھنے کی بجائے آپ کو ہی شہری حکومت میں تبدیل کر لینا چاہیئے چلیئے ہم بھول جاتے ہیں کہ خود راؤ فرمان علی کی کارکردگی کیا رہی، جب وہ خود جنرل یحییٰ کی جنتا کا ایک حصہ تھے اور مشرقی پاکستان کے ۱۹۷۱ء کے المیے کے ایک نمایاں اداکار تھے، چلیئے ہم انہیں شک کا فائدہ دیتے ہیں، اور ان کے نظریے کو ہم ان کے موجودہ رفقائے کار کے گذشتہ دس ماہ کے دور اقتدار میں حقیقی کارکردگی کی روشنی میں جانچیں۔

راؤ فرمان علی کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ساتھی جنرل، سیاستدانوں سے بہتر سیاست جانتے ہیں۔ شاید زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہیں یہ یقین ہے کہ جنرل بہتر حکمراں، منتظم، سفارتکار اور مدبر ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر دیکھیں تو ان کے ۱۰ ماہ کے دور اقتدار میں مسٹر بھٹو کی منتخب سیاسی حکومت کے اچھے یا کم از کم بہتر نتائج نکلنے چاہئیں تھے۔

عام طور پر پاکستان کے عوام کو اس ریکارڈ سے اچھی طرح واقفیت ہے کیونکہ نئے انتظام کا پھل حاصل کرنے والے وہی ہیں۔ لیکن آیئے ہم بھی ذرا اس ریکارڈ کا جائزہ لیں۔

کیا قیمتیں کم ہو گئیں؟ کیا زرعی اور صنعتی شعبوں میں پیداوار بڑھی ہے؟ کیا معاشی ترقی تیز ہوئی ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں نہیں ہے مزید یہ کہ اس وقت پوزیشن اس سے بھی بدتر ہے جو دس ماہ پہلے تھی۔ موسم سرما کے مہینوں میں پنجاب کے فاضل پیداوار کے اضلاع میں بھی گندم ۸۰ روپے من فروخت ہوئی، اب بھی جبکہ نئی فصل آچکی ہے اس کا بھاؤ ۶۵ روپے من ہے، دوسری تمام بنیادی اشیاء کی قیمتیں بھی مستقلاً بڑھتی رہی ہیں۔ حقیقی پوزیشن کی تصدیق خود جنرل ضیاء کے اس انکشاف سے ہو جاتی ہے کہ اس سال پاکستان کو ۲۲ لاکھ ٹن گندم درآمد کرنی پڑے گی۔

اس وقت تک مالیاتی خسارہ تین ارب کی حد تک پہنچ چکا ہے اور اواخر جون تک یہ تقریباً چار ارب تک پہنچ جائے گا برآمدات اس قدر کم ہوئی ہیں کہ یہ ایک ارب ڈالر سے بھی کم ہی رہیں گی، گرچہ محفوظات سے بہت کام لیا جا رہا ہے تاہم جو بات عام طور پر معلوم نہیں وہ یہ کہ ہم سیمنٹ، کھاد وغیرہ جیسی اشیاء بھی تین ماہ سے ایک سال تک کے مختصر میعادی قرضوں پر خرید رہے ہیں، اوپر سے ہم نے غیر ملکی قرض خواہوں کے قرضوں کی اقساط بھی ادا نہیں کی ہیں۔ ان تمام منفی واقعات کا مجموعی اثر آئندہ ماہ نئے بجٹ کے وقت نمایاں طور پر ظاہر ہو گا۔

ہمارے مولانا سیاستدانوں کی طرح جنرل بھی اسلامی نظام کے نفاذ کے متعلق بہت کچھ کہہ چکے ہیں لیکن دس ماہ کے عرصے میں انکی مطلق العنان حکمرانی کی حقیقی کارگزاری کیا رہی ہے؟ مختلف سطحوں پر کافی بحث و مباحثہ کے بعد زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ اور سود کا خاتمہ سب کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے، یہ ساری تدابیر انتہائی متنازع، ناقابل عمل اور عمائدین و سفید پوش حضرات کے مفاد کے خلاف معلوم ہوئیں۔ اس طرح موجودہ اسلامی نظام میں جو چیز باقی رہ گئی وہ صرف کوڑے مارنے کی سزا تھی اور وہ بھی صرف پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور مزدوروں کے لئے۔ اسے اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کم از کم یہ خاکسار مسلمان تو ایسی سزاؤں کو بربریت اور اسلام کے حق میں نقصان دہ سمجھتا ہے۔

سیمنٹ، کھاد جیسی چیزیں بھی قرضوں پر خریدی جا رہی ہیں

امن و امان، آمرانہ حکومتوں کے لئے ایک پسندیدہ اور معقول بہانہ ہوتا ہے۔ تاہم اس شعبے میں بھی انحطاط نمایاں ہے۔ بینکوں میں ڈاکے شاہراہوں پر ڈاکے، قتل، مار دھاڑ اور بچوں کے اغوا کے واقعات بہت زیادہ ہونے لگے ہیں اور بدعنوانی جو ہماری خصوصیت ہے وہ اسوقت عروج پر ہے۔

کیا یہی ریکارڈ جنرلوں کو سیاستدانوں سے بہتر حکمراں اور ناظم ثابت کرتا ہے؟ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ یہ ایک ایسی حکومت کا ریکارڈ ہے جسے کلّی اختیارات حاصل ہیں، جس کے پاس سرسری فوجی عدالتیں ہیں اور جو بڑی فیاضی سے کوڑوں کا استعمال کر سکتی ہے اور یہ وہ اختیارات ہیں جو سیاستدانوں کی نمائندہ حکومت کو کبھی حاصل نہیں ہوتے۔

امور مملکت اور ڈپلومیسی کے میدان میں اس حکومت کی کارگذاری کیسی رہی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال افغانستان کے ساتھ معاملات نمٹانے کی دی جا سکتی ہے۔

یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ صدر داؤد مرحوم نے اگست ۱۹۷۶ء میں جب پاکستان کا جوابی دورہ کیا تھا تو اس وقت مسٹر بھٹو کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ اس کی شرطوں کے مطابق مسٹر ولی خان اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا جاتا ساتھ ہی ایک معاہدہ ہوتا جس پر داؤد کے دستخط ہوتے اور ڈیورنڈ لائن کو دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیا جاتا۔ موجودہ حکومت نے مسٹر ولی خان اور انکے ساتھیوں کو تو رہا کر دیا لیکن ڈیورنڈ لائن کو سرحد تسلیم کراتے ہوئے معاہدے پر داؤد کے دستخط نہ حاصل کر سکی۔

"دی فار ایسٹرن ایکانومک ریویو" نے یہ تاثر دیا ہے کہ مسٹر ولی خان کی رہائی کے وقت حکومت کو اس معاہدے کے مسودے کی خبر نہیں تھی، پھر بھی جب مسٹر ولی خان اور انکے ساتھیوں تک کو اس کی اطلاع تھی تو یہ یقین نہیں ہوتا کہ دفتر خارجہ نے جنرلوں کو اس سے متعلق کچھ نہ بتایا ہو۔

کابل کے حالیہ انقلاب کے بعد حکومت کی کارروائی ذہانت سے بعید رہی ہے۔ حالانکہ نئی حکومت نے بہت جلد تسلیم کر لینے کی استدعا کی تھی تو بھی پاکستان نے کچھ دنوں تک انتظار کیا اور اسوقت حرکت میں آئی جب بشمول بھارت بہت سے ملک تسلیم کر چکے تھے۔ اور تشویشناک بات یہ ہوئی کہ مفتی محمود نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کے فوراً بعد ہی نئی حکومت اور ماسکو کے خلاف انتہائی جارحانہ بیانات دے ڈالے۔ اگر پی این اے کے رہنما اور حکومت بھٹو کے لئے غیر ملکی لیڈروں کی رحم کی اپیل کو پاکستان کے اندرونی معاملے میں مداخلت قرار دے سکتے ہیں تو وہ خود اپنے انتہائی اشتعال انگیز بیانات کے سلسلے میں کابل سے کس برتاؤ کی توقع رکھتے ہیں؟ اس افسوسناک کارگزاری کو بمشکل ہی تدبر یا ذہین سیاست کہہ سکتے ہیں۔

ان تمام امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک آدمی بس ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ گذشتہ ۱۰ مہینوں کے دوران پاکستان کی قوت اور حیثیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ نہ تو اندرونی لحاظ سے نہ ہی بیرونی فی الحقیقت ہم بڑی سرعت سے ایک قومی تباہی کی طرف پھسلتے جا رہے ہیں جو ۱۹۷۱ء کی تباہی سے بھی زیادہ سنگین ہو سکتی ہے۔

سبق بالکل واضح ہے۔ جنرل، سیاستدانوں کو حقیر سمجھ سکتے ہیں اور ہمارے بہت سے سیاستداں اس کے مستحق بھی ہیں لیکن یہ جنرل حضرات خود بھی یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ سیاسی لیڈر اور مدبر بن سکیں اگر فوجی جنتا خود کو شہری حکومت میں تبدیل بھی کر لیتی تو بھی نہ طبیعت کے لحاظ سے نہ ہی مزاج کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ پاکستان کے سیاسی و معاشرتی اور معاشی بحرانوں پر قابو پا سکیں۔ اس کے علاوہ اگر سیاست داں اتنے ہی برے اور نکمے ہیں تو پھر یہ جنرل نام نہاد قومی حکومت میں انہیں شریک کرنے کے لئے اتنے بے چین کیوں ہیں؟

ان حالات میں نئے خیالی نظریات کوئی کام نہیں آ سکتے۔ اب ایک اور بلکہ شاید آخری قومی المیہ کو روکنے کی واحد صورت یہی ہے کہ صحیح معنوں میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرا کر خود مختار عوام کو اپنا حکمراں آپ ہی چننے کا موقع دیا جائے۔ مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی کو راستے سے ہٹانے اور شکار کرنے کی جو کوششیں گذشتہ ۱۰ ماہ سے ہو رہی ہیں اس کے باوجود اب بھی پاکستان کی بقا کے لئے عوام کی رائے ہی آخری امید ہے۔

ملتان

قسور سعید مرزا

پیپلز پارٹی سے موقع پرست بھاگ گئے

صادق حسین قریشی اپنا وقت "پیپسی کولا" پر صرف کریں گے!

عباس حسین گردیزی اپنی وضعداری قائم رکھے ہوئے ہیں

مولانا کوثر نیازی کی طرف سے پاکستان پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو اور کارکنوں کو تخریب پسند قرار دیئے جانے کے بعد سرکاری نیوز ایجنسی اے پی پی نے مولانا کی حمایت اور تخریب پسندوں کی مذمت میں بعض سابق اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کے بیانات پنجاب سے جاری کئے۔ ظاہراً ملتان سے کسی سابق رکن قومی و صوبائی اسمبلی کا نام ان میں نہیں تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں وفاقی سطح سے لے کر صوبائی سطح تک ملتان کو بھرپور نمائندگی دی گئی۔ پنجاب کے سابق گورنر و وزیرِ اعلیٰ ملک غلام مصطفیٰ کھر، پنجاب کے سابق گورنر اور سابق وزیرِ اعلیٰ صادق حسین قریشی، قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان، سابق وفاقی وزراء سید ناصر علی رضوی، مخدوم حامد رضا گیلانی، فاروق لغاری، سردار عبدالعلیم خان، سینیٹ کے سابق ڈپٹی چیئرمین راؤ عبدالستار، سابق صوبائی وزراء ملک مختار احمد اعوان، ڈاکٹر صادق ملہی، ایم کے خاکوانی، شوکت مزاری، نصر اللہ خان دریشک، ان سب کا تعلق ملتان ڈویژن سے تھا۔

ملتان جہاں گذشتہ چھ سالوں میں پارٹی کو نہ تو شہری اور نہ ہی ضلعی سطح پر فعال اور عوامی قیادت نصیب ہوئی اور نہ ہی پارٹی کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد ہائی کمان نے یہاں فعال قیادت دینے کی کوشش کی۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں مخلص کارکنوں کو موقع دینے کی بجائے صادق حسین قریشی اور ناصر علی رضوی نے اقتدار کے گھمنڈ میں ایسے ایسے موقع پرستوں کو پارٹی ٹکٹ دلوائے کہ جن کی سیاسی شہرت موقع پرستی کی وجہ سے ہے۔ کسی زمانے میں ملتان کی سیاست گیلانی اور قریشی خاندانوں کی لونڈی ہوا کرتی تھی۔ یہ لوگ سیاہ و سفید کے مالک ہوا کرتے تھے۔ سرکاری ملازمین کے تبادلوں سے لے کر تقرریاں تک ان کے اشاروں کی مرہونِ منت ہوتی تھیں۔ لیکن آج صورتحال انتہائی مختلف ہے۔ قومی اتحاد کی جانب سے چلائی جانے والی تحریک کے دوران مخدوم حامد رضا گیلانی جو کہ وفاقی وزیر کے ساتھ ساتھ پیر بھی تھے، اپنے والد مرحوم کی خانقاہ پر نہیں جا سکتے تھے۔ اور یہ ملتان کے معروف قدیمی خاندان کی مقبولیت کا عالم تھا۔ صادق حسین قریشی اور پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ دو متضاد چیزیں تھیں۔ دراصل نبی بخش بھٹی پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ صادق حسین قریشی اور پنجاب کی وزارت اعلیٰ دو متضاد چیزیں تھیں۔ دراصل نبی بخش بھٹی پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ صادق حسین قریشی کے دورِ اقتدار میں پارٹی تنظیم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ پارٹی کے محنتی کارکن زیرِ عتاب رہے۔ اور یہی کارکن آج پارٹی کا سرمایہ بنے ہوئے ہیں۔

صادق حسین قریشی سیاست کے کھیل سے تھک کر اب ریٹائر ہونا چاہتے ہیں اور باقی وقت "پیپسی کولا" فیکٹری کی فلاح و بہبود پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ مخدوم حامد رضا گیلانی ہر جانب سے اپنے تعلقات قائم رکھے ہوئے، اپنی قدیمی روایات کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ صاحبزادہ فاروق علی خان نے اپنی وکالت شروع کر دی ہے۔ کبھی کبھی ان کی جانب سے اخباری بیان پڑھا جاتا ہے۔ مولانا کوثر نیازی سے اکثر ٹیلی فون پر گپ شپ رہتی ہے۔ ناصر علی رضوی اپنی "کامیاب" اننگز کھیل کر اگست ۱۹۷۷ء ہی میں پارٹی چھوڑ گئے تھے۔ مولانا کوثر نیازی کے ایک اور جگری دوست قومی اسمبلی کے سابق رکن رانا تاج احمد نون خاموشی سے صورتحال کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اکثر کارکنوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ شجاع آباد میں کسی کارکن نے کبھی تخریب کاری نہیں کی۔

دوسری جانب قومی اسمبلی کے سابق رکن سید عباس حسین گردیزی اپنی وضعداری قائم رکھتے ہوئے بُرے دنوں میں بھی بھٹو خاندان کے ساتھ وفادار ہیں۔ اور آئے دن اخبارات کو بیانات جاری کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ملک مختار احمد اعوان، خورشید احمد خان، ملک الطاف علی کھوکھر، خالد محمود بخاری، صوبائی اسمبلی کے سابق رکن احمد بخش بھیم، نذر سجاد قریشی، محمد اسلم لون اور ایم اے گوہر نے بھی پاکستان پیپلز پارٹی کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور اب تک قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ جو لوگ جا چکے ہیں ان کے جانے پر پارٹی کارکن اور عام آدمی بہت خوش ہے۔ کہ چلو بھٹو صاحب نے تو تطہیر نہیں کی اب خود ہی پارٹی میں تطہیر ہو گئی ہے۔ کارکن تو چاہتے ہیں کہ بقایا موقع پرست بھی ان کی جان چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔ بہر حال اقتدار پرستوں کی رخصتی سے ملتان ضلع میں پیپلز پارٹی مضبوط ہو گی اور فعال بھی۔
○○

جاوید اقبال کا صفحہ

"نیا پڑوس"

پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کوئی "صحافی" تو نہیں

۱۵ لاکھ یونانیوں نے ریفرینڈم میں حصہ ہی نہیں لیا

چرچ کے عہدے صرف حکومت کے ترانے گانیوالوں کو دیئے جاتے

شاہ کے ملک بدر اور بے اثر ہونے کے بعد پاپاڈوپولوس اور اس کی فوجی جنتا کو اپنی آمرانہ حکومت قائم کرنے اور اس پر اپنا ذاتی ٹھپہ لگانے کی آزادی مل گئی تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خصوصیات بھی ظاہر ہونے لگیں۔ اب ہر یونانی کے ذہن میں یہی سوال اٹھ رہا تھا کہ آخر یہ حکومت کب تک رہے گی۔ کیا یہ عبوری حکومت ہے یا یونان کے سیاسی ڈھانچے میں ایک مستقل حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے۔ ابتدا میں اس نے یہی کہا تھا کہ اس کی حیثیت عبوری ہے اور اس نے محض اس لئے اقتدار پر قبضہ کیا ہے کہ ملک کو درپیش ایک زبردست خطرے کا ازالہ کرے جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو یہ ملک کو مخلص و ذمہ دارانہ جمہوریت کی راہ پر لگا دیں گے۔ لیکن یہ اس وقت ہو گا جب عوام کا ذہن بالغ ہو جائے گا۔ اور ان کے اندر ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کا شعور پیدا ہو جائے گا۔ مملکت کے دشمن، سماجی نظام میں فتنہ و فساد برپا کرنے والے ایجنٹ معاشرے سے ختم ہو جائیں گے یا بے اثر کر دیئے جائینگے۔ عوام میں پھوٹ اور انتشار باقی نہیں رہا تو لوگ تعمیر کی طرف متوجہ ہو جائیں گے یونان کے "نجات دہندوں" کی آمد سے پہلے ملک میں جو بدعنوانیاں تھیں ان کا استیصال ہو جائے گا۔ صحت حاصل کرنے کے لئے سکون ضروری ہوتا ہے اس لئے قوم کو بھی فی الحال سکون سے رہنا چاہیئے فوجی جنتا کے نزدیک اس "سچی جمہوریت" کے لئے ایک آئینی منشور ضروری تھا، وہ ایک ایسا آئین بنانا چاہتی تھی جو جدید بھی ہو اور جمہوری بھی جس میں یونانی معاشرے کا خصوصی اور اہم مسائل ملحوظ رکھے جائیں جس سے "یونانیت" اور مسیحیت کی عکاسی ہوتی ہو۔

بالآخر ایک آئینی منشور تیار کیا گیا جس پر ۲۹ ستمبر ۱۹۶۸ء کو رائے شماری ہوئی ۹۲ فیصد ووٹ اسکی حمایت میں آئے لیکن یہ اکثریت اس طرح حاصل ہوئی کہ پندرہ لاکھ یونانی ووٹروں نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ رائے شماری سے پہلے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ رائے شماری کا بائیکاٹ کرنے والے کو ایک سال قید کی سزا ہوگی تاہم پندرہ لاکھ ووٹروں نے اس میں حصہ نہیں لیا جن لوگوں نے حصہ لیا انہیں بھی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ صرف موافقت میں ووٹ ڈالنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ رائے شماری سے پہلے یہ افواہ اڑا دی گئی کہ ہر شخص کے ووٹ کا پتہ چل جائے گا یعنی یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس نے موافقت میں ووٹ ڈالا اور کس نے مخالفت میں۔ ووٹنگ کے مراکز میں موافقت و مخالفت کے جدا جدا بکس تھے اور دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اس طرح ۹۲ فیصد اکثریت حاصل کرنے والے دستور پر اصول کلیت کی چھاپ پڑ گئی۔

اس کے باوجود اگر رائے شماری سے متعلق کسی کو کچھ خوش فہمی باقی رہ گئی تھی تو وہ چند دنوں کے اندر ہی دور ہو گئی۔ ۳ نومبر کو جارج پاپاندریو کے جنازے کا جلوس نکلا اس موقع پر ایتھنز کے باشندوں نے نئے دستور کی عوامی موافقت کا پول کھول دیا ۴ نومبر کو "نیویارک ٹائمز" نے اس سلسلے میں جو رپورٹ دی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

پاپاندریو کے آخری مراسم احتجاج میں تبدیل ہو گئے آج ہزاروں یونانیوں نے جارج پاپاندریو کی میت کے جلوس کے موقع پر فوجی پشت پناہی میں اٹھارہ ماہ سے چلنے والی حکومت کی صریح نافرمانی کا مظاہرہ کیا۔ سابق وزیر اعظم کی میت کو قبرستان لے جانے والے جلوس کے دو میل لمبے راستے میں عوام نے دو رویہ کھڑے ہو کر نعرے بلند کیئے۔ فوجی حکومت نے ملک میں تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر رکھی ہے لیکن لوگوں نے اس پابندی کو نظر انداز کرتے ہوئے پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے ۲۹ ستمبر کو نئے دستور سے متعلق جو رائے شماری کرائی تھی عوام نے اس کے لئے لفظ "اوچی" بمعنی "نہیں" کا استعمال کیا۔ لوگ چیخ رہے تھے کہ ہمارے ووٹ کہاں ہیں؟ تم نے اپنی تعداد ملا دی ہے اس طرح جارج پاپاندریو مرنے کے بعد بھی آزادی کی راہ میں ایک بڑی خدمت کر گئے۔ ان کی وجہ سے نئے دستور کی حمایت کا بھی پول کھل گیا۔ اور فوجی جنتا کا یہ دعویٰ بھی بے نقاب ہو گیا کہ اسے عوامی تائید حاصل ہے۔

یورپین کونسل کی مشاورتی اسمبلی کے اجلاس منعقدہ ۵ جنوری ۱۹۶۹ء میں مسٹر ڈین ڈراسٹول نے یونان کی صورت حال کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا

رائے شماری مارشل لاء کے تحت ہوئی۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں مجھے اپنے دورہ یونان کے دوران حکومت یونان کے مختلف ارکان سے سوالوں کے مختلف جوابات ملے تھے میں نے پوچھا تھا کہ کیا رائے شماری
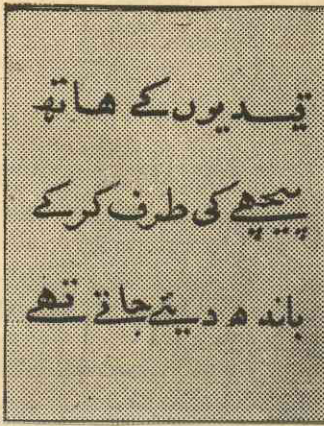
کی مہم چلانے کے دوران اور رائے شماری کے وقت مارشل لاء اٹھا لیا جائے گا وزیر خارجہ پیپی نیلیس نے اس کے جواب میں مجھے یقین دلایا کہ یہ رائے شماری قطعی آزادانہ اور دیانتدارانہ ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں رائے شماری کے وقت محاصرے کی سی کیفیت ختم ہو جانی چاہیئے لیکن حقیقت کچھ اور تھی یہ صحیح ہے کہ وہ سابق وزرائے اعظم مسٹر جارج پاپاندریو اور مسٹر کینے لوپولو سمیت کچھ سیاسی لیڈر ۲۳ ستمبر ۱۹۶۸ء کو رہا کر دیئے گئے تھے جب کہ رائے شماری میں محض ۶ دن باقی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم مسٹر پاپاڈوپولوس نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ رہائی پانے والوں کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیئے کہ انہیں دوبارہ قید کرنا پڑے جن سیاسی لیڈروں کو محض چند دن پہلے رہا کیا گیا ان سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ رائے شماری کی مہم میں کوئی حصہ لے سکیں گے۔ مجھے ایسی رپورٹیں بھی ملی ہیں کہ دیہات میں سربر آوردہ لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے اثرات سے کام لیتے ہوئے دستور کو کثرت رائے سے منظور کرائیں۔ اکیس سال سے ستر سال تک کے لوگوں کے لئے ووٹ دینا لازمی تھا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ایک سال قید یا جرمانہ کیا جا سکتا تھا، یا اس کا ورک پرمٹ اور ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ یا شناختی کارڈ ضبط کیا جا سکتا تھا۔ کرنل کے وضع کردہ دستور میں فوج کو ایسی حیثیت دے دی گئی جو شہری حکومت کی دسترس سے باہر تھی۔ سابقہ کراؤن کونسل کی جگہ کونسل آف دی نیشن "کے نام سے ایک نئی کونسل قائم کی گئی جس کے ممبروں کی تعداد ۵ تھی۔ ان میں ایک ممبر مسلح افواج کا سربراہ بھی ہوتا اس طرح فوجی افسر شاہی ملک کی بلند ترین کونسل میں پہنچ گئی۔ دستور کے تحت ایک آئینی عدالت کے قیام کا بھی فیصلہ ہوا جسے تمام سیاسی عمل کی نگرانی کے اعلیٰ اختیارات دیئے اس کے ارکان زندگی بھر کے لئے مقرر کئے جاتے۔ دستور کی ایک دفعہ میں کہا گیا کہ پارلیمنٹ کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ خارجہ پالیسی یا ملک کے دفاع سے متعلق کسی معاملے کی تحقیقات کے لئے کمیٹی مقرر کر سکے گویا ان دو محکموں کو یونانی عوام کے نمائندوں (پارلیمنٹ) کی رسائی سے خارج کر دیا گیا۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں اور جہاز راں کمپنیوں کے مالکوں کو خصوصی رعائتیں دی گیئں۔ اس دستور کے تحت جو قوانین بنائے گئے ان کے ذریعہ یونان کو غیر ملکی تاجروں کے لئے ایک "کھلا علاقہ" بنا دیا گیا اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ کرنلوں کو اپنا اقتدار غیر معینہ مدت کے لئے مسلط کرنے کا موقعہ ملے۔

دہشت گردی

اس بارے میں کوئی شک نہیں رہا کہ پاپاڈوپولوس

جارج پاپانڈریو کے جنازے کا جلوس، احتجاجی جلوس میں تبدیل ہو گیا

اور اس کے ساتھی اقتدار پر جمے رہنا چاہتے ہیں ان کے ہر عمل سے اسی مقصد کا نشان ملتا ہے انہوں نے تمام کلیدی عہدوں سے اپنے تمام مخالفین کو نکال دیا۔ پولیس حفاظتی عملہ، سول سروس، یونیورسٹی، اسکول، کالج، عدالت، بلدیاتی اداروں، کمیونیٹی کونسلوں، ٹریڈ یونینوں امداد باہمی کے اداروں غرضیکہ تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے انہوں نے اپنے مخالفین کو چن چن کر نکال دیا۔ بہتوں کو جبراً سبکدوش کر دیا گیا۔ ان میں سے بیشتر کو پنشن سے بھی محروم کر دیا گیا جن لوگوں کو اس طرح نکالا گیا ان کے لئے کسی پرائیوٹ ادارے میں بھی ملازمت کا حصول ممکن نہیں رہا کیونکہ کوئی بھی نجی ادارہ ان معتوب لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دے کر اپنے لئے مصیبت خریدنے کو تیار نہ تھا اس طرح ایسے لوگوں کے لئے محتاجی کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا یہ بڑی ہی وحشتناک صورت حال تھی۔

یونان کو اپنی تاریخ کے کسی دور میں .... اس دور میں بھی جب کہ اس پر نازیوں کا تسلط ہو گیا تھا ایسی دہشت ناک صورت حال سے سابقہ نہیں پڑا تھا فوجی جنتا، کی حکومت قائم ہونے کے بعد اٹھارہ مہینوں کے دوران کم از کم پچاس ہزار یونانیوں کو گرفتار کیا گیا اور ان میں سے بہتوں کو ڈرانے دھمکانے اور فوجی حکومت کا ہمنوا بنانے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ لیکن بہتوں کو عرصہ دراز تک مقید رکھا گیا۔ ہزاروں کو جیل میں رکھنے کے علاوہ ہزاروں افراد کو جزیرے کا کنسنٹریشن کیمپ میں رکھا۔ بہتوں کے لئے قید تنہائی تجویز کی گئی کسی کو پوچھ گچھ کے لئے خفیہ پولیس نے اپنی تحویل میں رکھ لیا غرضیکہ ملک کے اس سرے سے اس سرے تک قید و بند کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہا۔ قیدیوں کو بے پناہ اذیتیں بھی دی جاتی رہی ہیں انہیں ایسی ایسی اذیتیں دی گئیں کہ جن کا اس مہذب دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا یوں تو مختلف قسم کی اذیتیں ہوتی تھیں لیکن مصنوعی پھانسی اور الیکٹرک شاک لگانے کی اذیتیں ایسی تھیں جن سے آدمی نیم جان ہو جاتا تھا۔ کتنے ہی لوگ ان اذیتوں سے ہلاک ہو گئے، بہت سے لوگ اپاہج ہو گئے۔ کچھ لوگ رہا ہونے کے بعد ہی موت کا شکار ہو گئے۔

لیکن دہشت زدہ کرنے کا سلسلہ گرفتاری، قید و بند، اذیت، جلاوطنی وغیرہ سے بھی کہیں آگے تھا یہ سلسلہ سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ عدلیہ فوجی جنتا کی تابعدار تھی۔ جس کو بھی کسی عدالت میں فوجی حکومت کے مخالف کی حیثیت سے پیش کیا جاتا سزا اس کا مقدر ہو جاتی ناپسندیدہ شہریوں سے محصولات کی وصولی میں سختی کی جاتی اور سالہا سال کے واجبات وصول کیے جاتے۔ حکومت کے مخالفین کے لئے ٹورسٹ لائسنس، بزنس لائسنس، ڈرائیونگ لائسنس بلکہ موٹر سائیکل یا اسکوٹر تک کے لائسنس بند کر دیئے گئے، اور جن کے پاس تھے ان سے ضبط کر لئے گئے یا تجدید کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ عوام کو قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑنے لگا اس کے باوجود اخبارات میں حکومت کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۶۸ء کو ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں اس وقت کے یونان کا حقیقی نقشہ پیش کیا یہ رپورٹ برطانوی بار کے ایک رکن مسٹر انتھونی ماریکو اور امریکن بار کے ایک رکن مسٹر جیمس بیکر کی براہ راست تحقیقات پر مبنی تھی۔

اس رپورٹ کے اپنڈکس بی میں یونان کے سیاسی قیدیوں کو دی جانے والی اذیتوں کا کچھ حال درج ہے جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

قیدی کو ایک بینچ سے لگا کر باندھ دیا جاتا ہے پھر اس کے تلووں پر چھڑی یا پائپ سے ضرب لگائی جاتی ہے اس طرح بندھا ہوا قیدی بینچ کے گرد بھاگتا ہے اور اوپر سے اس پر مکوں کی بارش کی جاتی ہے اس کے بعد کا اقدام اس کے سینے کی ہڈی پر ضرب لگانا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں قیدی بالعموم خون تھوکنے لگتا ہے ایک اذیت وہ ہے جسے "فلنگانہ" کہتے ہیں۔ اس میں عام طور پر ایک قیدی کے پیچھے پانچ چھ آدمی لگا دیئے جاتے ہیں یہ لوگ قیدی کے حلق اور ناک میں پانی ڈالتے ہیں پھر اس کی آنکھ، ناک اور منہ میں صابن کا جھاگ ڈالتے ہیں پھر اسے کسی میز یا زمین پر اوندھا لٹا کر اس کی پٹائی کرتے ہیں۔

گلا گھونٹنے کی بھی نئی نئی ترکیبیں اختیار کی جاتی ہیں اکثر گندے کپڑے کے ٹکڑے پیشاب میں بھگو کر حلق کے اندر ٹھونس دیئے جاتے ہیں اس طرح قیدی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ گندہ کپڑا قیدی کے حلق سے اس وقت نکالا جاتا ہے جب اس کے مرجانے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ قیدی کے سر کو دیوار یا فرش زمین سے ٹکرانا بھی اذیت کی ایک صورت ہے بعض قیدی اس شدت کی تاب نہ لا کر دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

اکثر قیدیوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے باندھ دیئے جاتے ہیں پھر انہیں چھت سے لگا کر لٹکا دیا جاتا ہے اس طرح گھنٹوں انہیں لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جاتا ہے بعضوں کے پیٹ پر جمپ کیا جاتا ہے۔ کسی کے سر اور دوسری جگہوں کے بال ہاتھوں سے اکھیڑے جاتے ہیں جسم کے نازک اعضاء مثلاً آنکھ، ناک وغیرہ پر سرخ مرچوں کا سفوف ڈال دیا جاتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کے زندہ ناخن اکھیڑ دیئے جاتے ہیں کہ جسم کے گوشت کے ریزے بھی ادھڑ جاتے ہیں اور جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔ جسم کے نازک حصوں کو داغا اور جلایا جاتا ہے اس کے لئے خاص طور پر جلتا ہوا سگریٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ الیکٹرک شاک لگایا جاتا ہے۔

رپورٹ میں اذیتوں کی یہ چند مثالیں دیتے ہوئے کہا گیا کہ فوج اور پولیس کی طرف سے سیاسی قیدیوں کو عام طور پر ایسی سزائیں محض اس بنا پر

ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قید و بند کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہا

دی جاتی ہیں کہ ان پر فوجی جنتا کے مخالف ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسی بیشتر اذیتیں فوجی ہسپتال ۴۰۱ میں دی جاتی ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی مذکورہ رپورٹ کے مطابق جسمانی اذیتوں کے علاوہ غیر جسمانی یا ذہنی عقوبتیں بھی دی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ جو ذہنی اذیتیں سہہ چکے ہیں کہتے ہیں کہ غیر جسمانی اذیت، جسمانی اذیت سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے ایسی اذیتوں کے چند نمونے یہ ہیں۔

جن قیدیوں کو جسمانی اذیتیں دی جاتی ہیں انکے سیل سے متصل سیلوں میں دوسرے قیدیوں کو لا کر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ ان قیدیوں کی چیخ پکار سن کر دہشت زدہ ہوں۔ بعض قیدیوں کا کہنا ہے کہ دوسروں کی دردناک چیخ پکار سننے کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ آدمی خود ہی ان عقوبتوں میں مبتلا ہو، بعض قیدی محض دوسروں کی آہ و بکا سن کر ہی ہوش و حواس کھو بیٹھے، کسی کا اعصابی نظام درہم برہم ہو گیا۔

بعض حالتوں میں قیدیوں کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جہاں کئی کئی دنوں تک کھانا بلکہ پانی بھی نہیں دیا جاتا۔ سردی کا موسم ہو تو بھی اوڑھنا بچھونا تک نہیں دیا جاتا۔ بعض کوٹھڑیوں کے سامنے پانی کے حوض لبالب بھرے ہوتے ہیں۔ قیدی حوض کو دیکھتا ہے لیکن اس تک پہنچ نہیں پاتا چاہے اس کی پیاس کتنی ہی شدید ہو۔ قیدیوں کو ہر وقت طرح طرح کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور عورتوں کو آبروریزی اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں یونان میں تنہائی میں بھی برہنگی بڑی شرم کی بات ہے لیکن قیدیوں کو منظر عام پر برہنہ کر کے کوڑے لگائے جاتے ہیں قیدیوں کو مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے اکثر گولیاں چلانے والے دستے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ انہیں اس میدان میں لے جاتے ہیں جہاں سزائے موت دی جاتی ہے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتی ہیں اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں واقعی قتل کیا جا رہا ہے اس وقت ان کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسے مصنوعی قتل کے جانگداز لمحات سے بعض قیدیوں کو بار بار گزرنا پڑتا ہے۔

بسا اوقات کچھ کاغذات پر قیدیوں کے دستخط بھی لیئے جاتے ہیں اور اس کے لئے طرح طرح کے روح فرسا طریقے کار اختیار کئے جاتے ہیں ان کاغذات میں بالعموم قیدیوں کے رشتہ دار، اعزاء، دوست احباب وغیرہ کے خلاف غلط الزامات درج ہوتے ہیں۔ ان کی مذمت ہوتی ہے۔ ان کے خلاف غلیظ الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ بعضوں پر بعض نظریات کی مذمت اور مخالفت ہوتی ہے۔ ایک باشعور قیدی کے لئے ایسی دستاویزات پر دستخط کرنا جان دے دینے سے بدتر ہوتا ہے۔ لیکن انہیں دستخط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو دستخط نہیں کرتا اس پر بے تحاشہ تشدد کیا جاتا ہے اور جو دستخط کر دیتا ہے۔ اس کا پچھتاوے کے مارے برا حال ہو جاتا ہے۔ بعض اعصابی خلل میں مبتلا ہو جاتے ہیں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے وفد کو بعض ایسے قیدیوں سے ملنے کا موقع ملا۔ وفد کا کہنا ہے کہ ان قیدیوں کی ذہنی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ وفد نے ایک بڑا ہی دردناک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ ایک بوڑھے آدمی کی لڑکی سرطان میں مبتلا تھی اس سے یہ کہا گیا کہ "تم اس لڑکی کے خلاف مذمت کی دستاویز پر دستخط کر دو تو تمہیں اپنی لڑکی سے ملاقات کی اجازت مل جائے گی۔ اس نے اپنی لب گور لڑکی کو محض ایک نظر دیکھنے کی خاطر دستاویز پر دستخط کر دیئے پھر بھی اسے لڑکی سے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ اسے رہائی ملی تو اس وقت جب اسکی لڑکی کو مرے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔

سیاسی اور سماجی اداروں کے علاوہ چرچ کو بھی نہیں چھوڑا گیا ایک قانون کے ذریعہ چرچ سے ایسے تمام بشپ کو خارج کر دیا گیا ہے۔ جن سے حکومت کی مخالفت یا عدم تعاون کا اندیشہ تھا اب چرچ کے عہدے صرف ایسے ہی لوگوں کو دیئے گئے ہیں جو حکومت کے ترانے گا سکتے ہیں۔ حکومت نے اس بہانے چرچ پر قابو حاصل کیا کہ "یونان کو مسیحی یونان" بنانا اور ایسے عناصر سے نجات دلانا ہے جو اہل یونان کو مسیحیت سے دور کرنا چاہتے ہیں یونیورسٹی کے متعدد پروفیسروں کو بھی برطرف یا معطل کر دیا گیا ہے

انقلاب کی معاشرتی و سیاسی نوعیت

اس نئی حکومت کی بنیادی معاشرتی سیاسی اور نظریاتی خصوصیات کیا ہیں جس کا وجود ۲۱ اپریل کو ہوا اور متصادم قوتوں کے مابین اس کے دیر پا یا غیر دیر پا ہونے کے امکانات کس حد تک ہیں یہ دونوں سوالات بڑے ہی دشوار اور پیچیدہ ہیں کیونکہ یونان کے اندر برپا ہونے والے اس انقلاب کی حقیقی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لئے نہ صرف یونان کے اندرونی واقعات ہی کا جائزہ لینا کافی ہوگا، بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ یورپ اور تیسری دنیا کے ممالک کا ارتقاء کس نوعیت کا ہوتا ہے اور دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے رہتے ہیں نیز دنیا پر اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان کیسی کشمکش رہتی ہے۔

○○

شملہ خفیہ مفاہمت سکینڈل نذر آفتاب کا ایک تفصیلی تجزیہ

واجپائی کی طرف سے

خفیہ معاہدے کی رٹ

بھٹو کیخلاف ہے یا پاکستان کیخلاف

پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے متوقع دورۂ بھارت سے پہلے بھارتی جن سنگھی پارٹی کے وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی اور پاکستان میں بھارتی جن سنگھی کی دوست اور رہنما دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں خاص طور پر جماعت اسلامی کے سیاسی حلقوں اور حامی اخبارات نے انتہائی شدت کے ساتھ شملہ سمجھوتے کے موقع پر کسی خفیہ سمجھوتے کے سکینڈل کو اچھال دیا ہے یہ نہ صرف شملہ سمجھوتے کی صورت میں پاکستان کی سفارتی فتح کو شکست میں بدلنے کے لئے ہے بلکہ یہ سازش جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ کاٹنے کے لئے بھی ہے جو متوقع دورۂ بھارت کے دوران کشمیر کے مسئلے کو معاہدۂ شملہ کی روشنی میں حل کرنے کے لئے زور دینے والے ہیں۔ پاکستانی جن سنگھی اس انتہائی گھٹیا اور پاکستان دشمن سازش کے ذریعے خود بھارت کو معاہدۂ شملہ سے انحراف کے لئے تقویت دے رہے ہیں اور محب وطن پاکستانی اس کھلی پاکستان دشمنی کے مظاہرے پر سکتے کے عالم میں ہیں۔ ہو سکتا ہے جب یہ مضمون چھپ رہا ہو تو پاکستان کے سرکاری حلقوں کی طرف سے کوئی وضاحت آ چکی ہو۔ اس سلسلے میں یا تردید کی جائے گی یا تحقیقات کا حکم دیا جائے گا۔ تردید شاید نہ کی جائے کیونکہ اس وقت نوکر شاہی اور اس کی پشت پناہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کا سیاسی فائدہ اسی میں ہے کہ تحقیقات کرائی جائے اور اس حوالے سے پیپلز پارٹی اور بھٹو کے خلاف مزید غیر مصدقہ اخباری مہم چلانے کے لئے "سنہری" موقع مل سکے اور بھٹو کی قیادت میں امریکی سامراج کی مخالفت کا پاکستان اور اس کے مظلوم عوام کو مزہ چکھایا جا سکے۔ تاریخی ریکارڈ شاہد ہے کہ اس وقت بھارت میں چین کے خلاف امریکی سامراج کے لئے جاسوسی کا گھناؤنا جرم بے نقاب ہو چکا ہے۔ یہ وہی بھارت ہے جسے امریکہ کے صدر جمی کارٹر گذشتہ سال ایشیا کی قیادت کا سرٹیفکیٹ دے چکے ہیں۔ اب

ایشیا میں امریکہ کا یہی فائدہ ملک بھارت، چین کے جاسوس کے طور پر ننگا ہو چکا ہے اور اب بھارتی حکومت کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ بھارتی عوام کی اجتماعی لہر پہ قابو پانے کے لئے بھارتی رائے عامہ کو کسی ایسے افسانے سے بہلا دیا جائے جس سے بھارت کی موجودہ حکومت کے ایوان پاش پاش ہونے سے بچ سکیں ظاہر ہے کشمیر کے افسانے سے زیادہ دلچسپ اور خواب آور افسانہ اور کون سا ہو سکتا ہے یہی وہ نیند لانے والی گولی ہے جسے کھلا کر بھارت کے حکمران ۱۹۴۷ء سے اب تک بھارتی عوام کا خون چوس رہے ہیں۔ بھارت میں ان دنوں چین کی جاسوسی کا جرم اور شملہ مذاکرات میں اندرا بھٹو خفیہ معاہدے کے سکینڈل جیسے دونوں معاملات ایک ساتھ چل رہے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ بھارتی عوام کا رد عمل کس معاملے میں بارود میں چنگاری کا کام دیتا ہے جہاں تک بھارتی جن سنگھی موقف کے ہمنوا پاکستان کے دائیں بازو کے پریس کا تعلق ہے وہ بھارت کی جانب سے چین کی جاسوسی کے جرم پر بھارتی حکومت سے زیادہ پردہ پوشی کرنے کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس کے لئے پاکستان کے دفاع اور آزاد کشمیر کی آزادی کو داؤ پر لگا رہے ہیں اور اس حقیقت کے باوجود یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے کہ ۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء کو نئی دہلی میں پاکستان کے سرکاری وفد اور اخبار نویسوں کی موجودگی میں بھارت کے وزیر اعظم مسٹر مرار جی ڈیسائی واضح طور پر تردید کر چکے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ ۱۹۷۲ء کے پاک بھارت شملہ مذاکرات کے موقع پر کوئی خفیہ سمجھوتہ نہیں ہوا۔ مگر آج پاکستان میں بھارت کی سب سے معتبر شخصیت کی تردید کے باوجود جو کچھ لکھا اور چھاپا جا رہا ہے وہ شرمناک ہی نہیں دروغ گوئی اور بدنیتی پر مبنی ہونے کا اپنا ثبوت آپ ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کے دائیں بازو کے جن سنگھی دوست حلقوں کی طرف سے کشمیر کو بھارت کی جھولی میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ بچے کھچے پاکستان کو ہڑپ کرنے کے لئے مستقبل میں بھارت کی طرف سے جنگی سرگرمیوں کے مکروہ عزائم پر پردہ ڈالنا بھی ہے۔ بھارت کے ان شرمناک جنگی عزائم کا انکشاف حال ہی میں ۱۱ اپریل ۱۹۷۸ء کو بی۔ بی۔ سی نے اپنی نشریات میں کیا تھا۔ یہ انکشاف عین اس وقت ہوا جب پاکستان کا سرکاری وفد سلال ڈیم کے مسئلے پر گفتگو کے سلسلے میں نئی دہلی پہنچ چکا تھا، مگر اس سلسلے میں نہ تو سرکاری سطح پر ابھی تک بھارت سے وضاحت طلب کی گئی ہے اور نہ ہی بائیں بازو کے پریس کی طرف سے ان جارحانہ عزائم کی مذمت کی گئی ہے لیکن پردہ پوشی کی کوشش پوری شدت سے کی گئی ہے۔ بی۔ بی۔ سی کے انکشاف کے مطابق پاکستان سے دوستی کا دعوے کرنے والا بھارت دور تک پرواز کرنے والے نئے بمبار طیارے امریکہ سے حاصل کر رہا ہے یہ میراج طیارے اینگلو فرینچ جیگوار طیارے کہلاتے ہیں نیویارک میں امریکی تعلق خارجہ کونسل کے مسٹر ولیم نے واضح کیا کہ بھارت کی طرف سے جیگوار یا ایسے ہی طیارے خریدنے سے اس کی عسکری پوزیشن بہت بہتر ہو جائے گی۔ بی۔ بی۔ سی کے مطابق اس وقت بھارت کو پاکستان پر عسکری فوقیت حاصل ہے۔ دور تک گھس کر مار کرنے والے طیاروں کی خریداری سے دونوں ملکوں کے درمیان طاقت کے توازن پر زبردست اثر پڑے گا۔ اس کے علاوہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان اختلافات بڑھیں گے اور پاکستان کو اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا جو پہلے ہی بحران کا شکار ہے۔ پاکستان کو فضائی دفاع کے لئے نئی کوششیں کرنا پڑیں گی اور پاکستان کے عوام پر زبردست نفسیاتی اثر پڑے گا جبکہ پاکستان کی حکومت کو بھارت کے مقابلے میں ایسے ہی جدید طیارے خریدنا نہایت مشکل ہو جائے گا کیونکہ پاکستان کی اقتصادی صورت حال دگرگوں ہے اس کی درآمدات برآمدات سے کہیں زیادہ ہیں اس لئے ایسے مہنگے طیارے نہ تو امریکہ پاکستان کو دینا چاہے گا اور نہ ہی روس ایسے مہنگے طیارے فراہم کرے گا، جہاں تک چین کا تعلق ہے وہ ایسے طیارے بناتا ہی نہیں۔ ان حالات میں پاکستانی حکمرانوں کو ملک کے تحفظ کے لئے تشویش ہوگی۔

پاکستان کے حکمرانوں کو اس نئے جارحیت کے عزم پر کیا تشویش ہوئی یہ تو ہم نہیں جانتے کیونکہ سرکاری سطح پر کچھ نہیں کیا گیا ہے البتہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس طرح بھارت نے جنرل ضیا کے متوقع دورہ بھارت سے پہلے اپنی سوداکاری کی پوزیشن کو اور زیادہ بہتر بنالیا ہے جہاں تک پاکستانی پریس کا تعلق ہے تو دائیں بازو کے پریس نے عوام کی متوقع تشویش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے "خفیہ سمجھوتے" کے سکینڈل سے عوام کو مصروف رکھنے کی شدید اور ناکام کوشش شروع کر دی ہے۔

مبینہ شملہ سکینڈل کا حالیہ پس منظر

اسی سال یعنی ۱۰ اپریل کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مشیر برائے امور خارجہ آغا شاہی کی قیادت میں سلال ڈیم کے مسئلے پر سرکاری وفد نئی دہلی پہنچا۔ پالم کے ہوائی اڈے پر بھارت کے یہی وزیر خارجہ واجپائی جناب شملہ معاہدے سے انحراف کے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ بھارت پاکستان کے اندرونی معاملے میں مداخلت نہیں کرے گا، کیونکہ دونوں ممالک کی طرف سے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ یہ شملہ معاہدہ، جس کے تحت عدم مداخلت کے اصول کو منوا کر پاکستان نے بھارتی مداخلت کے رستے بند کئے تھے

۱۱ اور ۱۲ اپریل کو دونوں ممالک کے وفود کے اجلاس ہوئے۔ ۱۲ اپریل کو آغا شاہی نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سلال ڈیم کے مسئلے پر راضی نامے کی نوید دی۔ اسی پریس کانفرنس میں بھٹو صاحب کے طے کردہ تاریخی معاہدہ شملہ سے اخلاقی طاقت لیتے ہوئے جناب آغا شاہی نے کہا "شملہ سمجھوتے کے تحت دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں اب صرف کشمیر کا ہی ایک مسئلہ ہے جسے شملہ معاہدے کی روشنی میں طے کرنا باقی ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان سلال ڈیم معاہدے کے بعد وہ اس یقین سے وطن واپس جا رہے ہیں کہ شملہ سمجھوتے کے تحت تعلقات معمول پر آ رہے ہیں اور سلال ڈیم کا سمجھوتہ اس سلسلے میں آگے کی طرف ایک قدم ہے۔ دونوں ملکوں میں یقین کی جو فضا قائم ہے اس سے کشمیر کے مسئلے کے تصفیے کی راہ ہموار ہو گئی ہے یہی ایک مسئلہ ہے جس کا تصفیہ ابھی باقی ہے گویا آغا شاہی کے بیان کے مطابق شملہ معاہدے کی رو سے کشمیر ایک متنازعہ ہے اور اسی معاہدے کی روشنی میں اس تنازعہ کو حل کیا جائے گا

آغا شاہی کا بیان اس حقیقت کی تصدیق بھی کرتا ہے

کہ شملہ معاہدے کا کسی خفیہ معاہدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر خفیہ معاہدہ ہوتا جس کے تحت کشمیر کی کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کر لیا گیا تھا تو پھر شملہ معاہدے کے تحت مسئلہ کشمیر حل کرنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا پھر تو آغا شاہی کے لئے اس مسئلے پر بات تک کرنے کا بھی کوئی اخلاقی جواز نہ ہوتا۔

۳ اپریل کو محب وطن پاکستانی آل انڈیا ریڈیو کی یہ خبر سن کر سکتے میں آگئے کہ شملہ مذاکرات کے دوران بھٹو اندرا کے درمیان کوئی خفیہ سمجھوتہ ہوا تھا۔ محب وطن پاکستانی تو آغا شاہی کی پریس کانفرنس سے خوش تھے کہ شملہ معاہدے کے مطابق مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لئے بات آگے بڑھے گی کہ عین خوشی کے ان لمحات میں آل انڈیا ریڈیو نے "خفیہ معاہدے" کی خبر نشر کر دی اور پاکستانی اس خبر پر خون کے آنسو اس لئے بھی روئے کہ آل انڈیا ریڈیو نے خفیہ معاہدے کا یہ سکینڈل جس خبر رساں ایجنسی کی فراہم کردہ اطلاعات کے حوالے سے کیا وہ پاکستان کی خبر رساں ایجنسی پاکستان انٹرنیشنل ہے۔ پاکستان کے تمام اخباری حلقے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اس بظاہر آزاد خبر رساں ایجنسی پر عملاً دائیں بازو کا قبضہ ہے۔ مگر پاکستان کے عام شہری اس حقیقت کو نہیں جانتا یہی وجہ ہے کہ عام آدمی نے جو خون کے آنسو روئے وہ اسی دکھ میں کہ یہ جھوٹا سکینڈل پاکستان کی ایک خبر رساں ایجنسی کی طرف سے کریڈٹ کیا گیا ہے۔ جون ۷۲ء میں جب شملہ معاہدہ ہوا تھا اور جو پاکستان کی عظیم سفارتی فتح تھا اس وقت بھارتی جن سنگھی اٹل بہاری واجپائی نے خفیہ معاہدے کا اظہار کرتے ہوئے بھارت کی وزیر اعظم پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے سارا کشمیر پاکستان کو فروخت کر دیا ہے۔ یہ الگ بات کہ انہی دنوں بھارتی جن سنگھ کے پاکستانی ساتھیوں نے واجپائی کی ہمنوائی تو کی مگر اپنے مذموم مقاصد کے تحت اپنے بیان میں یہ ترمیم ضروری سمجھی کہ بھٹو نے کشمیر بھارت کے حوالے کر دیا ہے اگر وہ بیان میں یہ ترمیم نہ کرتے تو بھارتی جن سنگھ کی ہمنوائی کیسے ممکن ہوتی۔ بہرحال انہیں دنوں بھٹو نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر اس سکینڈل کی دو ٹوک تردید کر دی۔ بھارت میں اندرا گاندھی نے بھی تردید کر دی۔

چین کی جاسوسی کی بدنامی پر پردہ ڈالنے کیلئے خفیہ سمجھوتے کا انکشاف

جس سے بھارتی اور پاکستانی دونوں پاکستان دشمن جن سنگھی حلیفوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال آل انڈیا ریڈیو کی اس خبر سے جو تشویش ہوئی تھی اس کا ازالہ خود بھارتی وزیر اعظم نے کر دیا۔

۱۳ اپریل کو بھارت کی سب سے زیادہ با اختیار شخصیت وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے پاکستانی اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ شملہ معاہدے کی رو سے پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق سے گفتگو کے لئے تیار ہیں۔ ڈیسائی کا یہ بیان پاکستان کی زبردست فتح ہے کیونکہ شملہ معاہدہ ہونے سے پہلے تو بھارت کشمیر کے مسئلے پر گفتگو کے لئے ہی تیار نہ تھا۔ اُسے مسئلہ ہی نہ سمجھتا تھا بلکہ اس کا موقف تھا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے یہ شملہ معاہدہ ہی تھا کہ جس کے مطابق بھارت کو ماننا پڑا کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ نہیں ہے بلکہ ایک تنازعہ ہے۔ اخبار نویسوں سے اسی گفتگو کے دوران بھارت کے وزیر اعظم نے خفیہ معاہدے کے سکینڈل کے بارے میں واضح تردید کی جسے ہمارے دائیں بازو کے روزنامہ "جنگ" نے ۱۴ اپریل کو شائع کیا۔ بھارت نوازی کی حد دیکھئے کہ اس کی تردید کی اشاعت کے بعد بھی روزنامہ جنگ آج کل اس خفیہ معاہدے کے سکینڈل کو سچ ثابت کرنے کے لئے بے شرمی کی حد تک آگے بڑھ گیا ہے تاہم یاددہانی کے طور پر ہم ۱۴ اپریل کے روزنامہ "جنگ" کے صفحہ نمبر ۱۶ سے بھارتی وزیر خارجہ کا بیان من و عن نقل کئے دیتے ہیں روزنامہ "جنگ" کے مطابق

"جب مسٹر ڈیسائی سے پوچھا گیا کہ شملہ معاہدے میں بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان کوئی خفیہ بات بھی طے ہوئی تھی تو انہوں نے کہا کہ جب مجھ سے اس سلسلے میں پہلے بھی سوال کیا گیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ نہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی خفیہ بات نہیں ہوئی تھی یاد رہے کہ روزنامہ نوائے وقت نے بھارتی وزیر اعظم کا تقیہ بیان تو ہیڈ لائن آئٹم کے طور پر چھاپا مگر وزیر اعظم کی یہ وضاحت جس سے پاکستان کا وقار بلند ہوتا تھا شائع کرنے سے دانستہ گریز کیا۔ ۱۲ اپریل کو جب کہ بھٹو اور پاکستان کے بارے میں سکینڈل کی تردید ہوئی بھارت خود ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ اسی روز بھارتی پارلیمنٹ کے ارکان بھارت کی جانب سے چین کی جاسوسی کے الزام کی اشاعت پر برہم ہو گئے اس کی بنیاد پر امریکی جریدے "واشنگٹن امریکہ" میں چھپنے والی ایک رپورٹ تھی جس کے مطابق تیرہ سال قبل ۱۹۶۵ء میں امریکہ نے ایٹمی طاقت سے چلنے والا جاسوسی کا آلہ پلاٹونیم ری ایکٹر ہمالیہ کی چوٹی اور دریائے گنگا کے منبع پر نصب تھا۔ یہ کارروائی امریکہ کی ایک "کوہ پیما" ٹیم نے سرانجام دی تھی۔ اس کا مقصد چین کے ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات کا پتہ چلانا تھا۔ لیکن آلہ ہمالیہ کی برفوں میں دب گیا۔ اب اس کی تابکاری کی وجہ سے بھارتی گنگا کا پوترپانی آلودہ ہو جائے گا۔ واشنگٹن امریکہ کے مطابق یہ آلہ امریکہ کی رسوائے زمانہ تنظیم سی۔ آئی اے نے چین بھارت سرحدی جھڑپوں کے بعد بھارتی حکومت کے تعاون سے نصب کیا تھا۔ سی۔ آئی۔ اے کے سربراہ ایڈمرل سٹینلز ٹرنر نے اس خبر پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ۱۳ اپریل کو جب بھارتی پارلیمنٹ میں جاسوسی کے اس گھناؤنے فعل کے ردِ عمل کے طور پر شور مچا تو بھارتی وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی نے بادل نخواستہ کہا کہ حکومت تحقیقات کرائے گی۔ امریکی سفیر رابرٹ گوہین کو آگاہ کر دیا گیا ہے کہ وہ جلد رپورٹ پیش کریں گے۔

۱۷ اپریل کو وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں بھارت کی جانب سے چین کی جاسوسی کے الزام کی تصدیق کر دی۔ انہوں نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ یہ ایٹمی آلات امریکا اور بھارت کی حکومتوں نے باہمی رضامندی سے نصب کئے تھے۔ ایک آلہ جو ۱۹۶۵ء میں نندا دیوی پہاڑی کی چوٹی پر لگایا گیا تھا برف کے طوفان میں دب کر لاپتہ ہو گیا تھا لیکن دوسرا آلہ جو ۱۹۶۷ء میں

اس سے ملحقہ چوٹی پر لگایا گیا تھا وہ ایک سال بعد امریکہ واپس بھیج دیا گیا۔ ڈیسائی کے مطابق اس سے سی آئی اے کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ڈیسائی نے الزام سابق وزرائے اعظم پر لگایا۔

۲۲ اپریل کو سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے خبر رساں ایجنسی رائٹر کو بیان دیا انہوں نے کہا کہ نندا دیوی کی چوٹی پر چین کی جاسوسی کے لئے امریکی آلات اُن کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے نصب کئے گئے تھے اور مارچ تک انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا اور جب انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو وہ کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ اندرا گاندھی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت امریکہ کے ہاتھوں اپنے اندرونی معاملات میں بھی کس قدر بے بس ہے۔ بہرحال قصور کسی کا بھی ہو

۱۷ اپریل کو بھارتی پارلیمنٹ کے اجلاس میں وزیر اعظم ڈیسائی کی جانب سے جاسوسی کے جرم کی تصدیق کے بعد بھارتی رائے عامہ میں ہوش ربا تشویش پھیل گئی بھارت ننگا ہو چکا تھا اور یہی وہ وقت تھا کہ بھارتی رائے عامہ کو کسی اور افسانے سے بہلایا جائے چنانچہ اگلے ہی روز خفگی مٹانے کے لئے بھارتی وزیر خارجہ نے وزیر اعظم ڈیسائی کی واضح تردید کے باوجود شملہ مذاکرات میں خفیہ سکینڈل کو از سرِ نو تازہ کر دیا۔

۱۸ اپریل کو جبکہ بھارتی پارلیمنٹ میں ارکان شرم شرم کے نعرے لگا رہے تھے اور بھارت کی موجودہ حکومت سے یقین دہانی کرانے کا مطالبہ کر رہے تھے کہ آئندہ امریکی سامراج کے اشارے پر چین یا کسی اور ملک کے خلاف جاسوسی کا جرم نہیں کیا جائے گا۔ بھارتی وزیر خارجہ نے یہ یقین دہانی کرانے کے بجائے پارلیمنٹ کے اجلاس کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ اندرا گاندھی نے بھٹو کے ساتھ مل کر خفیہ معاہدہ کیا تھا۔ اور کشمیر کو پاکستان کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پارلیمنٹ کے ارکان اُن کی مخصوص جن سنگھی ذہنیت سے متاثر نہیں ہو رہے اور جاسوسی کے جرم پر مسلسل شور مچا رہے ہیں تو بھارتی وزیر خارجہ نے ایک نیا حربہ استعمال کرتے ہوئے اعلان کیا کہ بھارتی وزارتِ خارجہ کے پاس ایک دستاویز ہے جس سے اس اسکینڈل کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب اُن سے دستاویز پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ دستاویز دکھانا ملک کے مفاد میں نہیں۔ پارلیمنٹ کے ارکان نے کہا کہ جب آپ نے الزام لگانا ملک کے مفاد میں بہتر سمجھا ہے تو پھر الزام

شملہ معاہدہ ایک جنگی قیدی بریگیڈیئر منصور الحق ملک کی نظر میں

بھارتی اخبارات کو صدر بھٹو سے چڑ معلوم ہوتی تھی

"شملہ معاہدے" میں خفیہ سمجھوتے کا سکینڈل تو پاکستان کی ازلی دشمن اور اکھنڈ بھارت کی علمبردار جن سنگھ کے اٹل بہاری واجپائی نے شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے ہم نوا۔ قومی اتحاد کے حامی اخبارات اور رسائل بن گئے ہیں۔ بھارت میں جن سنگھ اور جماعت اسلامی کے حامی رسائل و اخبارات جو کچھ شائع کر رہے ہیں۔ انہیں جنگ، جسارت، نوائے وقت، زندگی، بادبان اور صحافت من و عن نقل کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی زمانے میں امرتسر ٹیلی ویژن پر بھارتی ثقافتی یلغار کا شور مچا تھا۔ بھارت پر گمراہ کن پراپیگنڈے اور پاکستان میں اندرونی مداخلت کا الزام لگتا تھا۔ لیکن اب پاکستان کے دشمن جن سنگھیوں کے خیالات کو ہندوستان میں اتنی پذیرائی نہیں مل رہی ہے جتنی پاکستان کے اخبارات و رسائل میں۔

کیا یہ مسئلہ صرف بھٹو دشمنی تک محدود ہے کہ بھٹو کے خلاف کہیں سے بھی کچھ ملے چاہے پاکستان کو خاکم بدہن نیست و نابود کرنے والی جن سنگھ کے لیڈروں کی طرف سے ہی کیوں نہ ہوا۔ اسے ضرور چھاپنا ہے یا یہ پاکستانی اخبارات و رسائل شعوری یا لاشعوری طور پر پاکستان دشمنی میں مبتلا ہو گئے ہیں شملہ معاہدہ۔ کھلا تھا یا خفیہ۔ یہ تو تاریخ ثابت کر رہی ہے کہ بھارت کے قبضے سے ۵ ہزار مربع میل علاقہ اس کے نتیجے میں ملا۔ جب کہ مصر ابھی تک سینائی کے علاقے سے محروم ہے۔ جنگی قیدی کسی شرط کے بغیر واپس آ گئے۔ ۱۹۳ جنگی قیدیوں پر جنگی جرائم کا مقدمہ بھی نہیں چلا مسٹر بھٹو کے پاس دینے کے لئے کیا تھا جون ۱۹۷۲ء میں وہ ایک شکست خوردہ قوم کی طرف سے گئے تھے۔ انہیں صرف لینا تھا اور دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اس کے باوجود معاہدہ ہوا۔ ۵ ہزار مربع میل علاقہ بھی مل گیا۔ رفتہ رفتہ جنگی قیدی بھی واپس آ گئے۔

ایک احسان فراموش قوم ہی اپنے کسی محسن کے احسانوں کو یوں بھلا سکتی ہے لیکن پاکستانی قوم نہیں بھلا سکتی۔ اس لئے اس سارے پراپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔

بریگیڈیئر منصور الحق ملک کی کتاب "جنگی قیدی کی ڈائری" جو اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور جو قید کے دوران ہی لکھی گئی۔ یہ کتاب سچے جذبات پر مشتمل ہے کیونکہ قید میں رہتے ہوئے نہ خوف ہوتا ہے نہ لالچ۔ اس زمانے میں جنگی قیدی معاہدہ شملہ کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے۔ اور ان پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ان کا کیا ردِ عمل تھا۔ یہ بریگیڈیئر منصور الحق ملک کی زبانی سنئے۔

اس کتاب کا پیش لفظ ریٹائرڈ میجر جنرل

احسان الحق صاحب ... کے رکن بھی ہیں۔ کتاب ... ہوتا تو وہ یقیناً اس کا ذ...

جوں جوں ...

ہے اندر بھٹو مذاکرا... بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر ک... تھا ۲۸ جون سے یہ مذا... اپنی پیشین گوئی کر رہا تھا ... جو دیوار پر کندہ کر دی گئی ...

۱۔ بھارت پاکستانی ...

۲۔ کشمیر میں دونوں ... قائم رہیں گی۔

۳۔ ڈپلومیٹک ... جائیں گے۔

۴۔ جنگی قیدیوں ... کے وعدہ پر وعید ہوا...

بھارتی ح...

کی بنیاد کو ثابت کرنے کے ... کے مفاد میں کیوں نہیں ہ...

اتی جن سنگھ، پاکستانی جماعت اسلامی، یک زبان و یک خیال

ت کرنے کے لئے دستاویز دکھانا ملک
یوں نہیں ہے؟ اس سوال کا واجپائی

کوئی جواب نہ دے سکے اور یہی کہتے رہے کہ دستاویز
نہیں دکھائی جائے گی۔

۱۹ اپریل کی شام کو راولپنڈی میں پاکستان کے سابق وزیر مملکت برائے امور خارجہ مسٹر عزیز احمد نے اپنی رہائش گاہ پر صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے اٹل بہاری واجپائی کے شملہ معاہدے کے متعلق سکینڈل کی واشگاف الفاظ میں تردید کی۔ عزیز احمد نے کہا کہ واجپائی کا بیان میرے لئے ایک معمہ ہے۔ شملہ مذاکرات میں میں ہر سطح پر شامل رہا ہوں۔ خواہ یہ مذاکرات سرکاری سطح پر یا اعلیٰ سطح پر ہوئے ہوں۔ میں اندرا گاندھی کے ساتھ تمام بات چیت سے پوری طرح باخبر ہوں۔ میں

واشگاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بھارت کی سابق وزیر اعظم اور پاکستان کے اُس وقت کے صدر مسٹر بھٹو کے درمیان اُن دفعات کے علاوہ جو معاہدۂ شملہ میں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں کوئی خفیہ سمجھوتہ نہیں ہوا سب کو معلوم ہے کہ عالمی اخبارات نے معاہدۂ شملہ کو جناب بھٹو کی سفارتی فتح قرار دیا تھا۔ اُس وقت پاکستان جنگ ہار چکا تھا اور طاقت کے ذریعے اُس کے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ اور ہندوستان کی فوجیں مغربی پاکستان کے چھ ہزار مربع میل کے علاقے پر قابض

ں صاحب نے لکھا ہے۔ جو آج کل الیکشن سیل
ہیں۔ کتاب کی کسی بات سے ان کو اختلاف
ینیاً اس کا ذکر کرتے۔
وں جوں جون کا آخر قریب آتا جا رہا
بھٹو مذاکرات کے سلسلہ میں کیمپ میں بے چینی
ں تھی۔ ہر کوئی اپنا اندازہ لگانے میں مشغول
ں سے یہ مذاکرات شروع ہونے تھے ہر کوئی
وئی کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنی پیشن گوئی
دہ کر دی گئی تھی یہ تھی۔
ت پاکستانی علاقے خالی کر دے گا۔
ر میں دونوں فوجیں اپنی اپنی پوزیشنوں پر
ں۔
ومیٹک تجارتی اور مواصلاتی رشتے استوار کئے
ں۔
ں قیدیوں کا مسئلہ آئندہ ملاقات میں طے کرنے
وعید ہوں گے۔

رجائیت پسند حضرات اس ملاقات کے فوراً بعد واپسی کی توقعات لئے بیٹھے تھے۔ کہ اب نظربندی کے ایام بس ختم ہونے کو ہیں میرا اپنا اندازہ اس سے مختلف تھا۔ مجھے مستقبل قریب میں فی الحال کوئی اُمید نظر نہ آتی تھی گفتگو شروع ہوئی ان دنوں ہمارے پاس ریڈیو نہیں تھا لاؤڈ اسپیکر پر ہمیں خبریں سنائی جاتی تھیں یا پھر اخبار سے خبر ملتی تھی ان دنوں قدرتی طور پر کسی کے دل میں کچھ کچھ لگی ہوئی تھی۔ آخر یہ اہم ملاقات تھی جس پر اگر اس دفعہ نہیں تو مستقبل میں ہماری واپسی کا انحصار تھا۔ ۲۸ جون گزری پھر ۲۹ جون بھی گذر گئی۔ وہ دن لمبے ہو گئے تھے وقت کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ۲۴ گھنٹے گزرنے کے لئے ۷۲ گھنٹوں کے برابر وقت لیتے پھر یکم جولائی آئی۔ تو افسر کچھ مایوس مایوس نظر آنے لگے خبروں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مذاکرات بالکل ناکام ہونے والے ہیں اگرچہ میں اپنے ساتھیوں میں اپنی واپسی کے متعلق ان مذاکرات کے بارے میں قنوطی تھا لیکن بالکل ناکامی کی مجھے بھی اُمید

نہ تھی ۲ جولائی کی خبروں میں مذاکرات کی قریباً قریباً ناکامی کا ذکر تھا اُس رات سونے والوں کے دل کافی بوجھل تھے تین جولائی کو صبح سویرے ہی کرنل آنند سنگھ آیا۔ اور مذاکرات کی کامیابی کی خبر دی اور مبارک بھی۔

مذاکرات کی کامیابی پر ہر کوئی خوش تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ عنقریب ہمارے علاقوں سے بھارتی فوجیں ہٹالی جائیں گی۔ بین الاقوامی معاملات میں قابض شدہ علاقوں سے دشمن کی فوج کا انخلا مشکل بھی ہوتا ہے اور وقت بھی لیتا ہے۔ اس ضمن میں شملہ معاہدہ پاکستان کے حق میں تھا۔ قیدی تو آخر واپس چلے ہی جائیں گے۔ آج نہیں تو دو سال بعد ہی سہی۔ پھر اس روز جب صدر بھٹو نے لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر عوام سے خطاب کیا اور اس تقریب سے ہم بڑے متاثر ہوئے خاص کر ان کے یہ کہنے سے کہ وہ شملہ میں قیام کے دوران فرش پر سوتے رہے ہیں کیونکہ ان کو یہ خیال تھا کہ ان کے قیدی بھی وہاں زمین پر سو رہے ہیں۔ قوم کے لیڈر میں اپنے لوگوں کے لئے ایسے احساس کی ایسی جھلک کا بے پایاں اثر رہا۔ اس کے بعد بھی ہم ریڈیو پر صدر بھٹو کی تقریریں سنتے رہے ان کی باتوں سے خود اعتمادی بڑھی اور جنگ کے بعد جو بے اعتمادی کے ابر چھا گئے تھے وہ چھٹتے دکھائی دینے لگے۔ قریباً قریباً ہر قیدی کو اپنے صدر کی قیادت

پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا اسی لئے ہم سب کو پاکستان کا مستقبل درخشندہ و تابندہ نظر آتا ہر تقریر کے چند روز بعد ان کے چند چست فقرات ہر ایک کی زبان سے سننے جاتے مثلاً سردار سورن سنگھ کا دہلی میں یہ کہنے پر کہ پاکستان کو بنگلہ دیش کو ماننا دینی پڑے گی صدر کا یہ جملہ "سورن سنگھ شٹ اپ" کیا آپ شٹ اپ کا مطلب سمجھتے ہیں؟ میں کہتا ہوں سورن سنگھ بکواس بند کرو یا ہم نے بھارت کی کورٹ میں بال نہیں فٹ بال پھینک دیا ہے وغیرہ وغیرہ اخبارات میں صدر بھٹو کی آمد اور شملہ میں مذاکرات کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا صدر بھٹو کی حاضر جوابی بے نظیر سے بھارت کے صحافی کافی متاثر معلوم ہونے تھے کیونکہ ان کے متعلق کافی تعریفی مضامین اور خبریں شائع ہوئیں پورے قیام کے دوران بھارتی اخبارات پڑھنے

یہ عیاں تھا کہ یہاں کے اخبار والوں کو صدر بھٹو سے کا چڑ ہے ان کے اندازِ تحریر سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ جہاں ہمارے صدر کی فراست اور سیاسی اہلیت کو مانتے ہیں وہاں ان کی انہی خصوصیات سے خائف بھی ہیں۔ ا کے خیال کے مطابق پاکستان کو قائد اعظمؒ کے بعد یہ سیاست دان لیڈر ملا تھا۔ جو بھارت کی قیادت پچھاڑنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

اخباروں میں دی گئی خبروں کا مفہوم ہمارے

مقیں اور اُس کے ۹۲ ہزار جنگی قیدی ہندوستان کی حراست میں تھے۔ ان حالات کے باوجود پاکستان کو سفارتی فتح نصیب ہوئی جس کا تمام دنیا نے اعتراف کیا۔

پاکستان کے سابق وزیر خارجہ کی وضاحت سے اٹل بہاری واجپائی ایک بار پھر ناکام ہوئے۔ مگر اس بار بھارت کے اندر امریکی سامراج کے اشارے پر چین کی جاسوسی کا جرم بے نقاب ہونے کی وجہ سے بھارتی حکومت بری طرح ناکام ہو چکی تھی اس لئے ۱۹ اپریل کو بھارتی اخبارات میں رائے عامہ کا رخ موڑنے کے لئے قومی سطح پر خبر دی گئی جس پر ۲۰ اپریل کو پارلیمنٹ میں زبردست ہنگامہ ہوا یہی خبر پاکستان کے دائیں بازو کے اخبارات نے اپنی ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں "لیڈ سٹوری" کے طور پر چھاپی۔ پاکستان کی سالمیت اور وقار کو مجروح کرنے اور جنرل ضیاء کے متوقع دورہ بھارت کو ناکام کرنے اور کشمیر کو بھارت کی جھولی میں ڈالنے کے لئے ہمارے اخبارات نے یہ خبر اور اس کی سرخیاں یوں شائع کیں جیسے یہ فی الواقع درست ہو حالانکہ پارلیمنٹ کے جب اجلاس کو رپورٹ کیا گیا اُس میں زبردست ہنگامہ ہوا تھا اور بھارتی وزیر خارجہ کی دروغ گوئی خود اُن کی تضاد بیانی سے آشکارا ہو رہی تھی۔ پھر بھارتی اخبارات نے جو خبریں شائع کیں وہ بھارتی وزیر خارجہ کے گذشتہ روز کے بیان کے عین مطابق تھیں۔ بلکہ ان میں یہ اضافہ ضرور کر دیا گیا تھا کہ مبینہ خفیہ معاہدے میں بھٹو اندرا کشمیر کی کنٹرول لائن کو مستقل اور بین الاقوامی سرحد ماننے پر اتفاق کر گئے تھے جبکہ اصل معاہدے کے تحت یہ سرحد محض کنٹرول لائن ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ کا ۲۰ اپریل کا اجلاس

"نظریہ پاکستان" کے خود ساختہ محافظوں اور تخلیق پاکستان کے مستند دشمنوں کے ترجمان اخبارات کے ۲۱ اپریل کے شماروں کے مطابق بھارتی اخبارات نے انکشاف کر دیا ہے کہ جون ۱۹۷۲ء کے شملہ مذاکرات کے موقع پر بھٹو اور اندرا گاندھی نے مسئلہ کشمیر کے واحد حل کے طور پر اصل کنٹرول لائن کو معمولی ردوبدل کے بعد مستقل بین الاقوامی سرحد ماننے پر رضامندی کر لی تھی۔ خبروں کے مطابق دونوں لیڈروں میں ہونے والی بات چیت پر مبنی ایک تحریری دستاویز بھارتی حکومت کے پاس موجود ہے بھارتی وزیر خارجہ

مقبوضہ علاقوں سے بھارتی فوجوں کی واپسی پر ہم سب سے زیادہ خوش ہوئے

کے خلاف اور بھارت کے حق میں ہوتا۔ یعنی یہ کہ بھارت کی حکومت تو ہمیشہ سے امن کی خواہاں رہی ہے اور ہر دفعہ جنگ میں پہل پاکستان کرتا رہا ہے بھارتیوں اور پاکستانیوں کا تہذیب و تمدن، زبان، رہن سہن سب کچھ یکساں ہے اور برصغیر کی تقسیم بے سود ہوئی۔ پاکستان کی چھوٹی موٹی گڑبڑ کو بڑھا چڑھا کر اور مبالغہ آمیز طور پر شائع کیا جاتا جس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی کہ پاکستان کی حالت بے حد خراب ہے بھارت کے صحافی اپنے ملک کے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جو اخبارات ہمیں ملتے تھے ان میں دو اردو کے اور تین انگریزی کے ہوا کرتے تھے ملاپ اور پرتاب اُردو کے اخبار تھے ان کا بیک گراؤنڈ بے حد گرا ہوا تھا پاکستان اور صدر بھٹو کے متعلق تمام خبریں اور اداریئے دشنام طرازی سے بھرے ہوتے ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، اور انڈین ایکسپریس انگریزی کے اخبار تھے ان کو پڑھنے سے ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے اخبارات کو ہمارے ملک کے معاملات سے زیادہ سروکار ہے اور اپنے ملک کے معاملات سے کم از کم ایک چوتھائی اخبار پاکستان کی خبروں سے بھرا ہوتا ان کے اداریوں میں پاکستان کی سیاسی معاشی فوجی ثقافتی کارکردگی اور مستقبل پر تبصرہ ہوتا۔ جن دنوں آندھرا پردیش میں افراتفری کا عالم تھا تب بھی ہمارے ملک کی خبروں کی سرخیاں موٹی ہوتیں جب پاکستان کی حزب اختلاف کی پارٹیوں نے اسمبلی میں آئین کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ اخباروں کی سب سے نمایاں سرخی تھی۔ لیکن جب پاکستان کا آئین تمام پارٹیوں کی رضامندی سے پاس ہوا۔ تو یہ خبر کہیں اندر کے صفحہ میں دو سطروں میں شائع کی گئی جس سے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ کہ پہلی خبر سے وہ کتنے خوش ہوئے اور دوسری سے جیسے ان کی ماں مر گئی ہو۔ ہمارے ملک کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر شائع کرنا بھارت کے صحافی اپنے لوگوں کا دل بہلانے کا سامان سمجھتے تھے۔ اور خود اپنے ملک کی مشکلات کو پس منظر میں دھکیلنا چاہتے تھے اس میں شک نہیں کہ بھارت میں صحافت پر اتنی پابندیاں نہیں جتنی ہمارے ملک میں ہوا کرتی تھیں خیالات کے اظہار کی وہاں زیادہ آزادی ہے مگر یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ وہاں کے صحافی اپنے قومی مفادات کو خوب سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ پچھلے ۲۷ برس کی جمہوریت نے ایسی سوجھ بوجھ کا جذبہ پیدا کرنے کا موقع دیا ہو گا۔ اظہار خیالات کا کھلا اختیار ملنے سے رفتہ رفتہ صحافت خود بخود ایسے اصولوں کی پابندی ہو جاتی ہے جس سے قومی مفادات کا تحفظ بھی ہوتا رہے گا۔ اور خیالات کا اظہار بھی بغیر کسی گرفت کے کیا جا سکے کئی اخباروں اور میگزینوں خاص کر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں کافی خطوط شائع ہوئے جن میں جنگی مسلسل نظر بندی کے خلاف احتجاج کیا ہوتا یہ اگرچہ حکومت ہند کی پالیسی کے خلاف تھا۔ مگر ایسے اظہار خیال پر ان پر کوئی پابندی یا بندش نہ تھی۔ سردار خشونت سنگھ نے جو ویکلی کے چیف ایڈیٹر ہیں پاکستان کی مشکلات کو اکثر سراہا اور جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے آواز بلند کی ڈیبک موریس نے ایک اداریہ لکھا جس میں قیدیوں کی مسلسل نظر بندی پر کڑی تنقید کی۔

مختلف اخبارات پڑھنے سے ظاہر ہوتا کہ حکومت کی اہم پالیسیوں پر خاص کر خارجہ پالیسی کے متعلق تمام اخباروں کو حکومت کی طرف سے ایک خاص طور اور انداز میں لکھنے کی ہدایت دی جاتی اور تمام اخباروں کے ایڈیٹروں کو اکٹھا کر کے آگاہ کیا جاتا کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا کہ کسی خاص عنوان کے تحت تمام اخباروں کا طریقِ فکر ایک ہی طرح کا ہوتا۔

بھارتی وزیراعظم کی طرف سے واضح تردید کے باوجود، مہم ابھی تک جاری ہے

نے آج پارلیمنٹ کے اجلاس میں ان اخباری اطلاعات کی تردید یا تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔ مسٹر واجپائی نے لوک سبھا میں اپوزیشن لیڈر مسٹر سی۔ ایم سٹوفنز کے اس الزام کی تردید کی کہ یہ خبر افشا کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ خبر نہ تو انہوں نے اور نہ ہی اُن کی وزارت نے دی ہے۔ درحقیقت وہ آج خود صبح کے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر حیران رہ گئے۔ مسٹر واجپائی نے بتایا ملک میں اخبارات آزاد ہیں۔ کانگریس کے رکن محمد قریشی نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ اندرا گاندھی بھٹو یا واجپائی کی مرضی کے مطابق جموں و کشمیر کے عوام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لوک سبھا کے سپیکر نے اپوزیشن کے لیڈر کو وہ تحریک التوا پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جو وہ مسٹر واجپائی کے اس بیان کے خلاف پیش کرنا چاہتے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ۱۹۷۲ء میں شملہ سمجھوتے کے وقت خفیہ مفاہمت ہو گئی تھی اور مسٹر واجپائی نے خفیہ معاہدے کے حلف کی خلاف ورزی کی ہے۔ لوک سبھا کے سپیکر نے تحریک التوا مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وزیر خارجہ نے کل اندرا بھٹو مفاہمت کے بارے میں بیان دے کر سرکاری معاملات کو خفیہ رکھنے کے حلف کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس پر لوک سبھا کے اپوزیشن کے لیڈر نے کہا کہ اندرا بھٹو خفیہ مفاہمت کی باتیں کس طرح ظاہر ہوئیں اور آج کے اخبارات میں کس طرح شائع ہوئیں وزیر خارجہ کو ان باتوں کی تردید یا تصدیق کرنی چاہیئے مگر وزیر خارجہ نے تصدیق یا تردید کرنے سے انکار کر دیا سپیکر مسٹر ہیگڈے نے لوک سبھا میں کہا کہ کوئی بھی وزیر اگر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے ضروری سمجھے تو سرکاری راز فاش کر سکتا ہے۔ ماضی میں بھی کئی راز فاش ہوئے ایک موقعہ پر جو چیز خفیہ رکھی جاتی ہے دوسرے موقع پر عوام کے علم میں لائی جا سکتی ہے سپیکر نے کہا کہ ۱۹۷۵ء میں بھارت میں ہنگامی حالت کابینہ کی منظوری کے بغیر نافذ کی گئی تھی۔ اس امر کو خفیہ رکھا گیا لیکن جنتا حکومت نے اس خفیہ بات کے بارے میں عوام کو آگاہ کر دیا۔ اسپیکر کی رولنگ سے قبل اور بعد ایوان میں ہنگامہ ہوا۔

ہم نے پاکستانی اخبارات میں چھپنے والی یہ خبر من و عن پیش کر دی ہے تاکہ آپ خود فیصلہ کر سکیں تاہم ہمارے دائیں بازو کے اخبارات نے اس کی سرخیاں یوں نکالیں جیسے یہ فی الواقع درست تھی، بھٹو دشمنی میں وہ اس حد تک آگے نکل گئے کہ پاکستان دشمنی شروع کر دی جس کا ثبوت ان اخبارات کے اگلے روز کے اداریوں سے بھی ملتا ہے۔ جبکہ ایک عام سوجھ بوجھ والا آدمی بھی ان خبروں کو پڑھ کر اندرونی تضاد کا خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ اس اجلاس میں بھارتی وزیر خارجہ نے بھارتی اخبارات کی تصدیق بھی نہیں کی۔ اور نہ ہی خفیہ دستاویز دکھانے پر تیار ہوئے، حالانکہ ایسا کرنا بھی یقیناً بھارت کے حق میں ہوگا۔ مگر دستاویز ہوتی تو دکھاتے۔ سپیکر کی طرف سے تحریک التوا مسترد کرنے کے عمل کو جس طرح سرخیوں میں دیا گیا اس سے بھارتی موقف کی حمایت کے علاوہ اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا کیونکہ سپیکر کی رولنگ ایک عمومی اصول کی وضاحت کرتی ہے کہ راز فاش ہو سکتے ہیں مگر یہ ہرگز ثابت نہیں کرتی کہ بھارتی اخبارات نے سچ لکھا ہے یا مسٹر واجپائی سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ مسٹر واجپائی تو خود ان خبروں کی تائید کرنے کو تیار نہ تھے وہ تو بقول ان کے یہ خبریں صبح کے اخبار میں پڑھ کر حیران ہو گئے تھے۔ اور پھر سپیکر نے خود اس مبینہ دستاویز کا مطالعہ نہیں کیا ہوا تھا یعنی واجپائی کا الزام ثبوت کے بغیر تھا۔ مگر ہمارے ہاں اخبارات کی سرخیوں سے یہی تاثر ملتا تھا جیسے اسپیکر نے واجپائی کے اسکینڈل کو درست قرار دیتے ہوئے تحریک التوا مسترد کی ہو واجپائی کے ۱۰ اپریل کے پارلیمنٹ کے بعد یہ بات خود ثابت ہوتی ہے کہ یہ خبریں انہوں نے خود چھپوائی ہیں کیونکہ چین کی جاسوسی کے الزام میں بھارتی حکومت کے ننگے ہو جانے کی وجہ سے اور جنرل ضیاء کے متوقع دورے سے پہلے پاکستان کو بلیک میل کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔

پاکستانی اخبارات کے اداریئے

۱۶ اپریل کو "نوائے وقت" نے اداریہ لکھا "بھارت کے ساتھ تعلقات۔ حقائق بھی پیش نظر رکھیں" اس اداریئے میں آغا شاہی کو کوسا گیا تھا کہ وہ سلال ڈیم کے معاہدے کی کامیابی پر خوش نہ ہوں کیونکہ ماضی میں بھارت نے ہمیشہ پاکستان کو نقصان ہی پہنچایا ہے اور وہ بات چیت برائے بات چیت سے کبھی انکار نہیں کرتا۔ نوائے وقت کے بقول ماضی میں بھارت کے ترجمان یہی کہتے رہے ہے کہ وہ پاکستان سے مطالبہ کریں گے کہ کشمیر بھی بھارت کے حوالے کیا جائے کیونکہ یہ اس کا اٹوٹ انگ ہے اور بھارت واضح کرے کہ وہ کن بنیادوں پر بات چیت کے لئے آمادہ ہے نوائے وقت یہ بھول گیا کہ ماضی میں بھارت کے اٹوٹ انگ کے دعوی کی موت کے طور پر شملہ معاہدہ ہوا تھا اور اب اسی بنیاد پر گفتگو ہوتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ نوائے وقت کشمیر پر گفتگو کے لئے کون سی نئی بنیاد تلاش کر رہا ہے؟ یہ خطرناک لائن دیتے ہوئے بھی نوائے وقت نے بھارت کو کوسنا ضروری سمجھا۔

نوائے وقت نے دوسرا اداریہ ۹ اپریل کو لکھا عنوان تھا۔ بھارت غیر جانبداری کا ڈھونگ اس میں تاریخی حوالے دے کر ثابت کیا گیا تھا کہ بھارت جھوٹا ہے۔ اس کی یقین دہانیوں کا اعتبار نہ کیا جائے بقول "نوائے وقت" "دھڑلے سے جھوٹ بولنے اور بے دریغ دھوکہ دینے کی جب عادت کو عادت بنا لیا جائے۔ تو پھر منافقت ایک اخلاقی برائی کے بجائے پیشہ اور فن کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ بھارت کے حکمرانوں نے بھی اس پیشہ اور فن میں بڑی مہارت پیدا کر لی ہے"۔

ابھی اس اداریئے کی روشنائی بھی خشک نہ

ہوئی تھی کہ "نوائے وقت" نے اگلے ہی روز یعنی ۲۰ راپریل کو ایک اور اداریہ بعنوان "بھٹو اور اندرا کے درمیان خفیہ مفاہمت؟" مارکیٹ میں پیش کر دیا۔ اس اداریئے میں نوائے وقت نے کھل کر بھارت نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ بھارت کے وزیر خارجہ اور اخبارات چونکہ اصرار کے ساتھ خفیہ مفاہمت کی باتیں کر رہے ہیں اس لئے معاملے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ نہیں نوائے وقت نے بھارتی موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے خود بھی چند مفروضے پیش کر دیئے سارا اداریہ بھارتی مؤقف کی تصدیق میں تھا آخر میں محض رسم پوری کرنے کے لئے تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ نوائے وقت کے مطابق اگر دیکھا جائے تو ۱۹ راپریل تک جھوٹ بولنے کے فن میں بھارتی حکمرانوں نے مہارت حاصل کر رکھی تھی مگر اچانک ۲۰ راپریل کو وہ سچے ہو گئے۔

پاکستان کے قیام کی دشمن اور ارباب "نظریہ پاکستان" اور "تحفظ پاکستان" کی نام نہاد ٹھیکیدار جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ جسارت کراچی نے ۲۰ راپریل کو نہایت بھونڈے طریقے سے پاکستان دشمنی اور بھارت نوازی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے طریقے طریقے سے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ کی جانب سے بھارتی الزام کی تردید کو ہی ماننے سے انکار کر دیا اور بھارتی اخبارات سے چار ہاتھ آگے نکل کر بھارتی سکینڈل کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ خفیہ معاہدے کی دستاویز پاکستان میں نہیں ملے گی کیونکہ بھٹو اہم کاغذات وزارتی دفاتر کے بجائے گھر رکھتے تھے؟ چلیئے چھٹی ہوئی۔ ثبوت ملے نہ ملے بھارت کے جن سنگھی وزیر خارجہ کی بات کی تصدیق تو ہو گی۔

یہ گھٹیا حرکت "جسارت" کی پالیسی کے عین مطابق مطابق ہے کیونکہ اسے ضمیر کی گہرائی میں اس بات کا پہلے سے خدشہ تھا کہ اس اسکینڈل کی تصدیق اگر ہو سکتی ہے تو وزارت خارجہ کی کسی دستاویز سے ہی ہو سکتی ہے اور چونکہ نہ تو ایسا کوئی خفیہ معاہدہ ہوا تھا اور نہ ایسی کوئی دستاویز مل سکتی ہے اس لئے اپنے بے ثبوت جھوٹ کو سچ منوانے کے لئے پہلے ہی کہہ دو کہ ثبوت نہیں ملے گا۔

جنگ کراچی نے ۲۰ راپریل کو اپنے اداریئے کا آغاز ہی ان الفاظ میں کیا کہ بھٹو اندرا خفیہ معاہدے کی جو خبریں ہم دیتے رہے ہیں بھارت نے ان کی تصدیق کر دی ہے۔ یعنی پاکستان کے خلاف سیاسی لائن جنگ اخبار دیتا ہے اور اس کی تصدیق بعد ازاں بھارت کرتا ہے۔

ہم نے جن حوالوں سے بات کی ہے وہ سب آن ریکارڈ ہیں۔ ہمارے اخبارات کا ریکارڈ خود ثبوت دے رہا ہے کہ پاکستان کے اندر بیٹھے ہوئے دائیں بازو کے یہ پاکستان دشمن پاکستان کے وقار اور سالمیت کو نقصان پہنچانے کے لئے کس بھونڈے طریقے سے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور جب ناکام ہو جاتے ہیں تو الزام بھٹو کے سر دھر دیتے ہیں۔ پہلے یہ بھٹو کے ثنا خواں ہوا کرتے تھے۔ آج کل جنرل ضیا کے مداح ہیں۔ خدا خیر کرے۔ اب دیکھیے آنے والی کل کی صورتِ حال میں یہ جنرل ضیا کے ساتھ خود کیا کیا سکینڈل وابستہ کرتے ہیں۔ انتظار کیجیے۔

معاہدہ کیا ہوتا ہے

سفارتی معاہدے دو یا دو سے زیادہ ممالک کے مابین ہوتے ہیں۔ یہ سمجھوتے ان مسائل کے بارے میں ہوتے ہیں جن سے وہ ممالک متاثر ہو رہے ہوں یا ہونے والے ہیں۔ معاہدے خفیہ ہوں یا کھلے عام یہ اشخاص کے درمیان نہیں بلکہ حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں جو باضابطہ طور پر تحریر میں لائے جاتے ہیں ان کی نقلیں متعلقہ خارجہ وزارتوں میں محفوظ رکھی ہوتی ہیں۔ ان معاہدوں کی توثیق بھی دونوں فریقوں کے تحریری دستخطوں سے ہوتی ہے۔ جبکہ شملہ مذاکرات کے موقع پر مبینہ خفیہ مفاہمت کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں کیونکہ جو معاہدہ ریکارڈ میں ہے اور جس کے دونوں ملک پابند ہیں اُس کی رو سے تو پاکستان کا مقبوضہ علاقہ خالی کیا گیا ۹۲ ہزار فوجی قیدی رہا ہوئے اور کشمیر کو متنازعہ کے طور پر تسلیم بھی کیا گیا اور کشمیر کی کنٹرول لائن کو عارضی تسلیم کیا گیا۔ پاکستان کی عظیم سفارتی فتح اس معاہدے کے ریکارڈ سے بخوبی آشکارا ہوتی ہے جبکہ جس خفیہ سمجھوتے کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے نہ تو ریکارڈ سے اس کی گواہی ملتی ہے اور نہ ہی اس کا کہیں اور وجود ملتا ہے۔ پاکستان کے علاوہ بھارت بھی ابھی تک جس معاہدے کی پابندی کو تسلیم کرتا ہے وہ شملہ معاہدہ ہی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ کشمیر ہڑپ کرنے کے لئے اس سے منحرف ہونے کی پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کوشش کر رہا ہو۔

شملہ معاہدے میں تو کشمیر کی کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد نہیں مانا گیا۔ کہیں یہ سب کچھ معاہدہ کشمیر کو منسوخ یا کالعدم کرانے کے لئے تو نہیں کیا جا رہا جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم مسلم کانفرنس آف کشمیر کے سردار عبدالقیوم نے تو زمانہ ہوا کہہ دیا تھا کہ ہم شملہ معاہدے کو سرے سے مانتے ہی نہیں اب نام نہاد خفیہ معاہدے کو سچ ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خفیہ مفاہمت ہوئی تھی تو یقیناً یہ پاکستان کے حق میں ہوئی تھی ورنہ واجپائی یہ نہ کہتے کہ اندرا نے کشمیر پاکستان کو فروخت کر دیا۔ اگر یہ بھارت کے مفاد میں ہوتا تو واجپائی اسے کبھی فاش نہ کرتے۔

بھارتی جن سنگھی اور پاکستان میں بھارت کے ایجنٹ مارچ میں بھٹو کے حق میں جس شدت سے مظاہرے ہوئے وہ خود ہی اس اسکینڈل کی تردید اور بھارت اور بھارتی ایجنٹوں کے خلاف نفرت کا کھلا ثبوت ہیں۔ اگر بھٹو نے کشمیر کے خلاف کچھ کیا ہوتا تو آج مقبوضہ کشمیر والے نہ تو اسے اپنا نجات دہندہ

باقی صفحہ ۴۲ پر

حکومتِ پاکستان نے ابھی تک اس کی تصدیق یا تردید کیوں نہیں کی،

کراچی / مجاہد بریلوی

۱۸، مئی، جمعیت گئی؟

طلبہ کی خاموش اکثریت ترقی پسندوں کے اتحاد کی منتظر ہے

۱۸ مئی - جمعیت گئی -
"امت رسول سے ایشیا سبز ہے -
"غدار ہے - غدار ہے"

"یونیٹی - یونیٹی - وکٹری - وکٹری"
"جامعہ کو کر گیا کالا - محمود احمد اللہ والا -"
تیز، تند، تلخ اور پرجوش نعروں سے جامعہ کے

درو دیوار گونج رہے ہیں - سرخ، سبز، نیلے، پیلے،
اور رنگ برنگے بینروں، جھنڈوں، بیجوں اور پمفلٹوں
کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے -

گوکہ ابھی تک تنظیموں کے درمیان اتحاد ، کاغذات نامزدگی داخل کرنے اور واپس لینے کے مرحلے کے سبب انتخابی سرگرمیاں اپنے پورے عروج پر نہیں پہنچی ہیں مگر جس بڑے پیمانے پر اس سال طلبہ وطالبات میں جوش وخروش پایا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بار کی انتخابی مہم جامعہ کی حد تک ملکی انتخابات سے کم ہنگامہ خیز نہیں ہوگی۔

جامعہ سے باہر سیاسی سرگرمیوں پر مکمل پابندی ہے مگر جامعہ میں ملک بھر کی سیاسی پارٹیوں کے نظریات اور نعروں کی دھیمی دھیمی دھمک طلبہ وطالبات کے نعروں اور تقریروں میں بڑی صاف سنائی دیتی ہے،

ایک طرف اسلامی جمعیت طلبہ کی منظم تنظیم ہے جو ایک سال چھوڑ کر پچھلے کئی برسوں سے جامعہ میں کامیاب ہو رہی ہے۔ مگر اس سال جمعیت طلبہ کا ابھی تک وہ زور نہیں دکھائی دیتا شاید اس کا سبب یہ بھی ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی تقریروں اور نعروں میں وہی رویہ نمایاں ہے جو عبوری حکومت کی حامی پارٹیوں کا ملکی سیاست میں ہے اور یوں وہ ماضی کی طرح حزب اختلافات کی تنظیم نہ ہونے کے سبب "خاموش اکثریت" کی حمایت سے محروم ہے۔

دوسری جانب اسلامی جمعیت طلبہ کی مخالف طلبہ تنظیمیں لبرل، پروگریسیو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس ہیں جو انتخابات میں ایک ہفتہ قبل تک ماضی کی طرح ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آخری مرحلے میں یہ متحد ہو جائیں مگر ان کے باہمی اختلافات کے سبب بائیں بازو کے حامی طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد سرگرم نہیں ہوسکی ہے۔

پچھلے کئی سالوں سے جامعہ کراچی کے انتخابات میں نظریاتی وابستگیوں کے باوجود طلبہ وطالبات کی اکثریت امیدواروں کی شخصیت کا چارم دیکھ کر ووٹ دے رہی ہے ۷۶ - ۱۹۷۵ء کی یونین کے انتخاب میں جب جامعہ کی تاریخ میں ایک طویل عرصے بعد لبرل اور پروگریسیو فرنٹ کو کامیابی حاصل ہوئی تھی تو اس کا کریڈٹ بھی اتحاد اور نظریات سے ہٹ کر عبدالرحیم اور خورشید حسنین کے خصوصاً طالبات میں مقبول ہونے کو گیا تھا۔ گذشتہ سال پھر اسلامی جمعیت کی جیت ہوئی مگر شخصیت کا "کلٹ" اس انتخاب میں بھی رہا یہی وجہ سے کہ گذشتہ سال کے انتخابات میں لگنے والے نعروں میں نمایاں "طلبہ کے دل کا چین مصطفین، مصطفین" "بھولا بھالا محمود احمد اللہ والا" جیسے غیر سیاسی نعرے تھے مگر اس سال کی انتخابی مہم کے ابتدائی مرحلے میں سیاسی رنگ نمایاں ہیں۔

تیز و تند نعرے
طلبہ کی نظریاتی سوچ کا
مظہر بن گئے ہیں

اس بار خلافِ معمول کاغذات نامزدگی یونین کی ہر پوسٹ کے لئے بڑی تعداد میں داخل کئے گئے ہیں۔ صدر، جنرل سکریٹری، جوائنٹ سیکریٹریز اور نمائندگانِ کلیات کی مجموعی نونشستوں کے لئے ایک سو دو امیدواروں نے کاغذات داخل کئے ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جامع کی ہر طلبہ تنظیم نے ہر عہدے کے لئے ایک اور ایک سے زائد امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے ہیں اور صحیح صورتحال ۱۳ مئی تک ہی سامنے آسکے گی جو کاغذات نامزدگی واپس لینے کا آخری دن ہے توقع ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے صدارتی امیدوار سلیم مغل ، جنرل سیکریٹری محمد عارف اور جوائنٹ سیکریٹری محمد سلیم ہوں گے۔ لبرل پروگریسیو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس کیونکہ ابھی تک اتحاد کے مرحلے میں ہے اسلئے ان کے امیدواروں کے نام ابھی واضح نہ ہوسکے ہیں تاہم اگر لبرل، پروگریسیو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس میں اتحاد ہو جاتا ہے

لبرل، پروگریسو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس کا بروقت اتحاد کامیابی کی نوید بن سکتا ہے

تو پھر ان تنظیموں کے مشترکہ صدارتی امیدوار مصطفین کاظمی، جنرل سکریٹری مظفر معراج اور جوائنٹ سکریٹری محمد طیب ہوں گے۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے جلسوں اور جلوسوں میں سارا زور اپنے مخالفوں کو پیپلز پارٹی کا دم چھلا قرار دینے اور "امت رسول سے ایشیا سبز ہے" کے نعرے پر ہوتا ہے۔ جن امیدواروں کو اسلامی جمعیت طلبہ نے نامزد کیا ہے ان میں بھی کوئی ایسا امیدوار نہیں ہے جو اپنی "شخصیت" کی بنیاد پر ووٹ حاصل کرے۔

دوسری جانب لبرل، پروگریسو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس میں شامل تنظیمیں ہیں جو اتحاد کے کٹھن اور پیچیدہ مسئلے سے ابھی تک گزر رہی ہیں ان تنظیموں کے پرجوش حامی ہر صورت میں "اسلامی جمعیت طلبہ" کے خلاف متحدہ محاذ چاہتے ہیں۔ مگر ان تنظیموں کے درمیان "امیدوار" اختلاف کی چھوٹی سی وجہ بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا جس کی ضرورت ملک کی سنگین سیاسی صورت حال کے پیش نظر یہ تنظیمیں محسوس کر رہی ہیں تو یقیناً اس "متحدہ طلبہ محاذ" کی طاقت کے آگے اسلامی جمعیت کی مضبوط تنظیم اور بے پناہ وسائل کمزور پڑ جائیں گے۔

طلبہ تنظیموں کے اندرونی اور بیرونی جھگڑوں، سیاسی موشگافیوں اور جلسے جلوسوں میں شامل ہونے والے سرگرم کارکنوں کے علاوہ بھی "طلبہ وطالبات" کی خاموش اکثریت کلاسیں اور اپنی ذاتی دلچسپیاں چھوڑ کر آرٹس لابی میں آ گئی ہے اب سے پہلے تک اس خاموش اکثریت کا رخ اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف ہوتا تھا مگر اب ملک کی مجموعی سیاسی صورت حال کے پیش نظر اس کا رخ جمعیت طلبہ کی مخالفت میں ہے۔ دراصل یہی "خاموش اکثریت" ہے جو جامعہ کراچی کے انتخابات میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

جلسوں، اور جلوسوں کو دیکھتے ہوئے لگتا تو یہی ہے کہ یہ خاموش اکثریت لبرل اور پروگریسو فرنٹ کے ساتھ ہے مگر بنیادی مسئلہ خود ان طلبہ تنظیموں کے اتحاد کا ہے جس میں اگر مزید تاخیر ہوتی تو پھر آخری دنوں میں اتحاد اور خاموش اکثریت بھی اسلامی جمعیت طلبہ کی جیت کو ناممکن نہ بنا سکے گی۔

اللہ اکبر

جامعہ میں جمعیت کی یونین کے اٹھارہ ماہ کیسے رہے؟

جامعہ کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی یونین کی مقررہ مدت گذرنے کے چھ ماہ بعد بالآخر یونیورسٹی انتظامیہ کو ۸، ۱۹، ۷۷، ۱۹ء کی یونین کے انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرنا پڑا۔

یوں تو ایک طویل عرصے سے یونیورسٹی، انتظامیہ اور اساتذہ کرام میں جماعت اسلامی کے گھس بیٹھیوں کی سرپرستی سے اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے جامعہ کراچی کو اچھوت" بنانے کی کوششیں جاری ہیں مگر اب حکومت کی تبدیلی کے بعد سے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار کے تعاون سے اسلامی جمعیت طلبہ کو اس سلسلے میں کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔

گذشتہ سالوں میں جامعہ سے فارغ التحصیل جمعیت طلبہ کے حامیوں کو دوبارہ بڑی تعداد میں مختلف شعبہ جات میں داخلے دلوائے گئے ہیں یہ طالب علم نما صالحین جنہیں جامعہ کراچی میں "تھنڈر اسکواڈ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ہتھیاروں سے لیس صرف خاص خاص موقعوں پر جامعہ میں دکھائی دیتے ہیں۔

جامعہ کراچی کی سلور جوبلی کے موقع پر جامعہ کے طلباء و طالبات نے جب لبرل اور پروگریسو فرنٹ کی قیادت میں اپنے مطالبات کے سلسلے میں احتجاج کیا تھا تو ان سے نبٹنے کے لئے اسی "تھنڈر اسکواڈ"، کو استعمال کیا گیا تھا اور اب جب کہ انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہو چکا ہے تو ایک بار پھر سے تھنڈر اسکواڈ" مصروف عمل ہے

اسلامی جمعیت طلبہ کی یونین اپنی پیش رو لبرل اور پروگریسو کی یونین کے مقابلے میں اٹھارہ ماہ کے دوران طلبہ و طالبات کے مسائل کس حد تک حل کر سکی، اور نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کی اس نے کس حد تک حوصلہ افزائی کی اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ جامعہ کراچی کا "ہفتہ طلبہ" جو دراصل جامعہ کے ساڑھے آٹھ ہزار طلبہ و طالبات کی ثقافتی، سماجی اور نصابی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے گذشتہ مہینے یعنی یونین کی مقررہ مدت گذرنے کے پانچ ماہ بعد منایا گیا اور اس "ہفتہ طلبا" میں بھی صرف جماعت اسلامی کے دانشوروں سیاسی، رہنماؤں اور صحافیوں کی بحیثیت مہمان شرکت کے سبب طلبہ و طالبات کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ "ہفتہ طلبہ" کے پہلے روز سیرت کانفرنس میں پانچ ہزار طلبہ کے لئے مخصوص وسیع و عریض پنڈال میں صرف تین سو طلبا موجود تھے اور ان میں بھی اکثریت باہر سے آتے ہوئے مہمانوں اور جمعیت طلبہ کے کارکنوں کی تھی۔ ہفتہ طلبہ کے باقی پروگراموں میں بھی ایک مخصوص ذہن کے مہمانوں کی شرکت کے سبب طلبہ کی اکثریت

پروگرام کے دوران پنڈال کے بجائے آرٹس لابی میں ہوتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی یونین آج جب طلبہ و طالبات کے سامنے جوابدہ ہے تو اپنے اٹھارہ ماہ کے دور میں اگر کوئی قابل ذکر کارکردگی بتاتی ہے تو وہ یہی "ہفتہ طلبہ" ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی جمعیت کی یونین نے کاغذی کارروائی کی حد تک بھی جامعہ کے طلبہ و طالبات کو درپیش ٹرانسپورٹ جیسے اہم ترین مسائل سمیت کسی بھی ایک مسئلے کو حل کرنے کی جانب قدم نہیں بڑھایا اس کے برعکس اسلامی جمعیت طلبہ کی یونین نے وہ مقاصد بخوبی ادا کئے جو اس کے سرپرستوں کی بنیادی پالیسی کا ایک حصہ ہیں یعنی جامعہ کی خود مختاری کو سلب کر کے اسے سرکاری سرپرستی میں چلوانا۔ لبرل اور ترقی پسند طلبہ کو تشدد کا نشانہ بنانا اور ان کا تعلیمی کیریر تباہ کرنا۔

مستقبل میں خواتین یونیورسٹی کے ممکنہ قیام کی راہ ہموار کرنے کے لئے طلبہ و طالبات کے صحت مند خوشگوار تعلقات کو سکینڈل بنا کر پیش کرنا اور جامعہ جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارے کا تقدس ختم کرنا۔

اٹھارہ ماہ کے دوران شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا ہو جب اسلامی جمعیت طلبہ نے کسی نہ کسی بہانے طلبہ اور اساتذہ کا اسکینڈل نہ کھڑا کیا ہو یا اپنی مخالف طلبہ تنظیم کو تھنڈر اسکواڈ کا نشانہ بنایا گیا ہو۔

جامعہ کے شعبہ طبعیات کے ایک استاد فاروق اکبر اور اسی شعبہ کی ایک طالبہ شاہین فاطمہ کا اسکینڈل انجمن طلبہ کے سیکرٹری غلام مجتبیٰ کا اسکینڈل اور سلور جوبلی کے موقع پر طلبہ و طالبات پر تشدد یونین کے وہ کارنامے ہیں جو اس نے اپنے اٹھارہ ماہ کے دور اقتدار میں انجام دیئے ہیں

سندھ میں ہاریوں کی بیدخلیاں

کراچی کی مزدور،

طلبہ تنظیموں

کی مشترکہ

کمیٹی کی رپورٹ

یکم مئی کو کراچی کی مختلف محنت کش مزدور، سیاسی اور طلبہ تنظیموں نے ایک مشترکہ اجلاس میں اندرون سندھ اور خصوصاً دیہہ مبارک واہ اور گوٹھ بھلاول کھوسو نیو سعید آباد میں ہاریوں کی جبریہ بیدخلی کے واقعات کی اطلاعات پہنچنے پر واقعات وحالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی منتخب کی۔ اس کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مذکورہ بالا متاثرہ علاقوں میں جاکر بیدخل ہونے والے ہاریوں کو اپنی حمایت کا یقین دلائے اور واقعات وحالات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد رپورٹ پیش کرے۔ اس مقصد کیلئے ایک وفد روانہ ہوا۔ مختلف تنظیموں کی جانب سے روانہ کئے جانے والے

اس وفد میں منتخب شدہ کمیٹی کے اراکین (۱) اکرم دھاریجہ، مزدور کسان پارٹی۔ (۲) شفیع کلہوڑو، کراچی مزدور رابطہ کمیٹی (۳) کلیم درانی، نوجوان محاذ پاکستان کے علاوہ زبیر الرحمٰن نیشنل پروگریسو پارٹی، محمد عارب سندھی ہاری کمیٹی احمد کامران، نوجوان محاذ پاکستان، شاہد علی، پروگریسو فرنٹ جامعہ کراچی اور عمر عباس شامل تھے۔

ہاریوں کی بیدخلی کے واقعات کے بارے میں اس وفد کی رپورٹ درج ذیل ہے:

ہاریوں کو بے دخل کرنے والوں کی پشت پناہی

مسلم لیگ کے وڈیرے کر رہے ہیں

ہاریوں سے پیپلز پارٹی کی حمایت کا انتقام لیا جا رہا ہے

حیدرآباد سے ۵۳ میل دور دیہہ مبارک واہ تعلقہ ہالہ میں ٹنڈو جام کے زمیندار میر اللہ بخش تالپور کی ۵۰۵ ایکڑ زمین ہے جو، مختلف کھاتے داروں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس زمیندار خاندان نے یہ زمین قیام پاکستان سے پہلے با اختیار افراد سے مل کر دھاندلی کے ذریعے ہتھیائی تھی۔ اور اس کا تنازعہ برقرار ہے۔

اس زمین پر ۵۴ جوڑے ہاری کاشت کرتے ہیں۔ یہ ہاری موروثی ہیں۔ اس زمین پر ہاریوں کے پانچ گوٹھ آباد ہیں۔ (۱) گوٹھ محمد بخش کھوسو (۲) گوٹھ صفر پھور (۳) گوٹھ پیر محمد جھتو (۴) گوٹھ گوڑا بالادی (۵) گوٹھ سومار بالادی۔ اس کے علاوہ گوٹھ محمود ساند

اس زمین سے باہر واقع ہے لیکن اسکے دو جوڑے اس زمین پر کاشت کرتے ہیں۔

متذکرہ زمین زمیندار اللہ بخش تالپور نے مقاطع پر دی ہوئی ہے، موجودہ تنازعے سے قبل یہ زمین دو مہاجر مقاطع داروں سیٹھ عثمان اور الیاس ملّا کو دی ہوئی تھی۔ ان سابقہ مقاطع داروں کا زمیندار سے معاہدہ ہوا تھا کہ وہ زمیندار کی مرضی کے صرف چار جوڑوں کو چھوڑ کر باقی تمام ہاریوں کو بے دخل کر دیں گے لیکن ہاریوں کی جانب سے مزاحمت کی بنا پر مقاطع دار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور تنازعہ کا تصفیہ ایک شخص سیّد مقیم شاہ نے کرایا۔

سابقہ مقاطع داروں کی مدت ختم ہونے کے بعد زمیندار نے اس زمین کو نئے لوگوں کو پانچ سال کے مقاطع پر دی۔ یہ نئے مقاطع دار علاقے کے مشہور بدمعاش، پاتھاریدار اور ہسٹری شیٹر ہیں۔ ان میں عمر موچی، ہسٹری شیٹر، محمد بخشیم ہسٹری شیٹر، محمد علی خشک ہسٹری شیٹر کے علاوہ راجو خشک، حاجی چنیسر خشک اور ڈنل خشک شامل ہیں۔ ان مشہور بدمعاش اور پاتھاریداروں کو اس شرط پر مقاطع دیا گیا تھا کہ وہ تمام موروثی ہاریوں کو زمین سے بیدخل کریں گے اور ان سے گوٹھ کو بھی خالی کرائیں گے اس کام کے عوض انہیں یہ مراعات دی گئیں کہ (الف) پہلے دو سال مقاطع مفت دیا گیا ہے۔ (ب) اگلے تین سال مقاطع صرف/۱۰۰ روپے فی ایکڑ ہوگا۔ جبکہ اس علاقے میں عام شرح ۲۰۰ سے ۳۰۰ روپے فی ایکڑ ہے۔ (ج) ۱۰۰ ایکڑ زمین انکے نام کردی جائے گی۔

ان بدمعاش مقاطع داروں کی سربراہی بدنام زمانہ پاتھاریدار رحیم ڈنو میرے پوٹو کر رہا ہے، زمیندار اللہ بخش تالپور اور ان مقاطع داروں اور پاتھاریداروں کی اصل پشت پناہی مسلم لیگ کے صوبائی آرگنائزر ذوالفقار علی شاہ جاموٹ کر رہا ہے، یہ ٹولہ گارڈ فادر گروپ کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا کام پاتھاریداروں کے ذریعے بیدخلیاں کرانا اور ڈاکے ڈلوانا ہے۔

نئے مقاطع کا آغاز مارچ ۷۸ء سے ہونا تھا۔ لیکن پاتھاریداروں نے دسمبر ۷۷ء میں ہاریوں کی بیدخلی شروع کی۔ ۷ دسمبر ۷۷ء کو ۱۶ ٹریکٹروں کے ساتھ غنڈے آئے اور دھمکیاں دیں۔ دوسرے روز تقریباً ۲۵۰ غنڈے ٹریکٹروں کے ساتھ اور پولیس کی ہمراہی میں آئے اور انہوں نے گوٹھ محمد بخش کھوسو کو مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا۔ یہ پولیس سیکھاٹ اور اوڈیرولال کے تھانوں سے آئی تھی۔ باقی گوٹھ سومار بالادی، کوڑا بالادی، صفر بیھضور اور پیر محمد چھٹو کی ناکہ بندی کر دی تاکہ کوئی مدد نہ آسکے۔ ۱۶ دسمبر ۷۷ء تک گوٹھ کا مکمل محاصرہ رہا اور فائرنگ کی جاتی رہی، گوٹھ میں پانی کی رسد ختم ہوگئی حتیٰ کہ بچوں کے پینے کے لئے بھی پانی نہ بچا۔ مال مویشی وغیرہ کے لئے گھاس اور چارہ بھی موجود نہ تھا۔ غنڈوں نے ۱۲ ایکڑ پر لگی ہوئی چارے کی کھڑی فصل پر ٹریکٹر چلا کر تباہ کر دیا۔ ۱۶ تاریخ کو بدقت تمام محاصرہ ٹوٹا۔

بعدازاں ایس ڈی ایم ہالہ نے مداخلت کرکے ۲۲ دسمبر کو ہالہ میں فیصلہ کیا کہ متنازعہ زمین کا ۸۱ فیصد حصہ ہاریوں کے پاس ہوگا اور باقی ۱۹ فیصد حصہ مقاطع داروں کو مل جائیگا ہاریوں نے اور مقاطع داروں دونوں نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا لیکن ۲۸ دسمبر کو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بغیر کسی اشتعال کے وڈیروں کی جانب سے ایک بار پھر گوٹھ محمد بخش کھوسو کو گھیرے میں لیکر فائرنگ شروع کر دی گئی۔ گوٹھ کے اطراف کی حفاظتی باڑ کو آگ لگا دی گئی۔ زمیندار کے ساتھ آکر غنڈوں نے گوٹھ کے ۶ کولیوں کو باندھ کر ان پر سخت تشدد کیا پولیس تھانوں میں رپورٹ درج کرانے کی کوششیں کی گئیں لیکن کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی۔ گوٹھ صفر بیھضور کے تین ہاریوں پر تشدد کرکے انہیں بھی شدید زخمی کیا گیا۔

جب سے اب تک گوٹھ پر چار سے زائد مرتبہ باقاعدہ فائرنگ اور مسلح حملہ ہو چکا ہے۔ ۱۰ کولی خاندانوں کو مار پیٹ کر گوٹھ سے بھی نکال دیا گیا ہے اور انکے مکانوں پر ٹریکٹر چلا کر انہیں زمین بوس کر دیا گیا۔ سابقہ مقاطع داروں کے زمانے کی بوئی ہوئی فصلوں کو واٹر کورس کو توڑ کر تباہ کر دیا گیا ہے فصلوں کو تباہ کرنے کے ان اقدامات کے نتیجے میں ۱۸۰ ایکڑ زمین پر بوئی گئی گندم میں سے ۵۵ ایکڑ کی فصل بالکل تباہ ہوگئی۔ باقی زمین میں سے فصل خراب ہو جانے کی وجہ سے صرف چار سے پانچ من گندم فی ایکڑ حاصل ہوئی جبکہ عام شرح ۲۵ من فی ایکڑ ہے۔ ۴۰ ایکڑ پر بوئی گئی گنے کی فصل میں سے ۴ ایکڑ بالکل تباہ ہوگئی ہے۔ گنے کی کچھ فصل میں وڈیروں نے آگ لگا دی۔ باقی زمین میں سے صرف ۲۰۰ من گنا فی ایکڑ حاصل ہو سکا ہے جبکہ عام شرح ایک ہزار من فی ایکڑ ہے۔ اس طرح ہاریوں کی فصلوں کے کل نقصان کا تخمینہ تقریباً ۳ لاکھ ۸۰ ہزار روپے ہے۔ اس زبردست نقصان کے نتیجے میں ہاری معاشی طور پر بدحال ہو چکے ہیں اور انکے پاس کھانے کے لئے غذائی اجناس بھی نہیں بچی ہیں۔

۲۱ اپریل ۷۸ء کو اپنی فصل کا گنا کاٹتے ہوئے تین ہاریوں رحیم بخش کھوسو، توق علی کھوسو اور عرس بیھضور کو پولیس اور غنڈے گرفتار کر کے لے گئے اور ان پر مختلف چوریوں کے جھوٹے مقدمے قائم کر کے ٹنڈو جیل میں قید کر دیا گیا ہے۔

ہاری خاندانوں کی کیفیت یہ ہے کہ پاتھاریداروں اور زمیندار نے خوف، دھمکی، دہشت گردی اور لالچ کے ذریعے ۶ ہاری جوڑوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ جن میں ۲ جوڑے پنجابی، دو جوڑے ساند اور ۲ جوڑے بالادی ہیں۔ ۸ جوڑے دہشت زدہ اور مایوس ہو کر غیر جانبدار اور خاموش ہو گئے ہیں۔ ۱۰ کولی گھرانوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر بیدخل کر دیا گیا ہے اور گوٹھ سے نکال دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ۲۱ جوڑے آج تک عورتوں اور بچوں کے اغوا اور ڈاکوؤں کی دھمکیوں، فائرنگ اور ناکہ بندی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مزاحمت کرنے والے ان جوڑوں میں ۷ کھوسو، ۱۰ بیھضور، ۳ لغاری اور ایک نذیر

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ زمیندار اور مقاطع داروں نے ہاریوں کی زمین پر غیر قانونی طور پر ٹریکٹر چلانا اور فصل کی بوائی شروع کر دی ہے ہاریوں کی زمینوں پر رات گئے تک ٹریکٹر چلتے رہتے

ہیں ۔ علاقے میں ہر دم کشیدگی کی فضا ہے، ہاریوں کو اپنے گوٹھ کی حفاظت کے لئے رات بھر جاگ کر پہرہ دینا پڑتا ہے اور کسی بھی لمحے غنڈوں کی جانب سے فائرنگ اور حملے کا خطرہ موجود رہتا ہے، ہاریوں کی جانب تقریباً ۳۰ یا ۳۵ مرد ہیں جن کے ذمے اپنے گوٹھ جانوروں اور عورتوں وبچوں کی حفاظت کا کام ہے ۔ مردوں کے گوٹھ سے باہر جانے میں ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ غنڈے گوٹھ پر حملہ کر کے عورتوں بچوں اور مال مویشی اٹھا کر لے جائیں گے اور گوٹھ پر قبضہ کر لیں گے ۔ مردوں کے گوٹھ سے باہر جانے پر عورتیں گوٹھ کی حفاظت کرتی ہیں اور کئی مرتبہ ایسی صورت میں جب گوٹھ میں صرف عورتیں بچے اور بوڑھے افراد تھے تو غنڈوں کے مسلح حملے کا موثر دفاع عورتوں نے کیا ہے اور غنڈوں کو واپس بھاگنے پر مجبور کیا ہے ۔ اس وقت کپاس کی فصل کی برائی کا وقت ہے لیکن موجودہ صورتحال میں ہاری اپنی زمینوں پر ربیع کی فصل کی بوائی بھی نہیں کر سکتے ہیں جبکہ وڈیرے ٹریکٹر چلاتے پھر رہے ہیں ۔

ہاریوں نے بھاگ دوڑ کر کے ڈپٹی کمشنر اور مختارکار وغیرہ کے پاس درخواستیں دی ہیں، اور اپیلیں کی ہیں ۔ سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے بھی اپیلیں کی ہیں ۔ لیکن پگارا مسلم لیگ ذوالفقار علی شاہ جاموٹ کے اثر ورسوخ کی وجہ سے کچھ نہیں ہوا اخبارات ورسائل میں دیہہ مبارک واہ کے ہاریوں کے بارے میں بیانات اور رپورٹیں وغیرہ بھی شائع ہوئی ہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ یکم مئی کے اخبارات میں تعلقہ ہالہ کے مختارکار نے ایک اخباری بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دیہہ مبارک واہ میں ہاریوں کی بیدخلی کے بارے میں شائع ہونے والی تمام خبریں اور بیانات جھوٹے ہیں اور وہاں کوئی بیدخلی نہیں ہوئی ہے، اور یہ کہ مقاطع داروں کا ہاریوں کے ساتھ سلوک بہت اچھا ہے، لیکن دیہہ مبارک واہ جانے والے وفد نے اپنی آنکھوں سے اس کے برعکس صورتحال دیکھی ہے، مقاطع داروں نے علاقے میں مسلح گھوم کر خوف ودہشت کی فضا قائم کر رکھی ہے

ہاریوں کو اپنے گوٹھوں کی حفاظت کے لئے رات بھر جاگنا پڑتا ہے

اور وہ سینہ زوری کے ساتھ ہاریوں کی زمینوں پر رات گئے تک ٹریکٹر چلاتے پھر رہے ہیں، جبکہ ہاری رات رات بھر اپنے گوٹھ کی حفاظت کے لئے پہرہ دینے پر مجبور ہیں، کراچی سے جانے والے وفد کے پہنچنے پر بھی وڈیروں کی جانب سرگرمی شروع ہو گئی تھی اور جیپوں میں غنڈوں کی کمک پہنچ گئی تھی ۔ اسوقت وہاں پر تمام مذکورہ بالا بدنام زمانہ پاتھاریدار اور بدمعاش موجود تھے ۔ مزاحمت کرنے والے ہاری خاندان آخر دم تک لڑنے اور مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسکے لئے انہیں سیاسی، قانونی اخلاقی مالی اور ہر قسم کی مدد کی ضرورت ہے ۔

گوٹھ بھلاول خان کھوسو دیہہ نیو سعید آباد

یہ گوٹھ تقریباً ۱۰۰ سال سے آباد ہے ۔ اس میں ۲۵۰ ہاری خاندان رہتے ہیں یہ گوٹھ کسی وڈیرے کی زمین پر نہیں بلکہ سرکاری زمین پر قائم ہے اور یہاں پر گذشتہ ۲۰ سال سے ایک پرائمری اسکول بھی قائم ہے ۔

اس گوٹھ کے ہاریوں کے زیر کاشت زمین کا رقبہ تقریباً ۳ سے ۴ ہزار ایکڑ ہے ۔ اس زمین پر کاشت کرنے والے ۲۰۰ ہاری گھرانوں میں سے ۱۰ سے ۱۵ ہاری مالک کسان ہیں جبکہ باقی تمام بے زمین ہاری ہیں اس گوٹھ کی زمین مختلف زمینداروں میں بٹی ہوئی ہے ۔ ان میں سے بڑے اور بارسوخ زمیندار غوث محمد شاہ اور بچل شاہ وغیرہ ہیں ان زمینداروں کی سرپرستی پیر پگارا ذوالفقار علی شاہ جاموٹ اور پیر راشدی خاندان کرتا ہے ۔

اکتوبر ۷۷ء کے متوقع انتخابات کے دور میں غوث محمد شاہ نے اس گوٹھ کے ہاریوں نگر کھوسہ اللہ ودایو مینگو اور گل بیگ کو بلا کر اپنے امیدوار کو ووٹ ڈالنے کو کہا ۔ ہاریوں کے منع کرنے پر اور گذشتہ دور میں زمینداروں کے مخالف سیاسی موقف اختیار کرنے کے جرم میں نومبر ۷۷ء میں زمینداروں نے ہاریوں کی بیدخلی شروع کر دی مسلم لیگ کے زمینداروں نے موجودہ حکومت میں اپنے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھا کر گذشتہ دور میں اپنے سیاسی مخالف اور پیپلز پارٹی کی حمایت کے جرم ہاریوں سے انتقام لینے کے لئے یہ اقدام کیا ۔ زمینداروں نے ہاریوں کو یہ دھمکی دی ہوئی ہے کہ وہ نہ صرف زمین سے بیدخل ہو جائیں بلکہ گوٹھ کو بھی خالی کر دیں ۔

اب تک کھوسے اور کولی گھرانوں کو بیدخل کیا جا چکا ہے ۔ زمیندار اپنے غنڈوں کے ساتھ آ کر گذشتہ سال کی کپاس کی فصل اٹھا کر لے گئے ۔ بیدخل کرنے کے لئے تقریباً ۳۰۰ غنڈے مسلح ہو کر ٹریکٹر ساتھ لے کر آئے تھے ۔ ان غنڈوں کے ہمراہ نیو سعید آباد تھانے کی پولیس کے جوان بھی SHO ملک بشیر احمد کی قیادت میں آئے تھے ۔ پولیس کی موجودگی میں گوٹھ بھلاول کھوسو کی ناکہ بندی کی گئی اور تمام راستے کاٹ دیئے گئے ۔ تین ہاریوں پھل دولت اور جمعہ کھوسہ کے مکانات کو آگ لگائی گئی اور تقریباً ۳۰ ہزار روپے کا نقصان کیا گیا ۔

نگران کھوسو کو غنڈے اغوا کر کے لے گئے ۔ اس کے مکان پر آئے ہوئے ایک مہمان محرم علی خالخیلی کو بھی احتجاج کرنے پر اغوا کر لیا ۔ انہیں ۸ روز تک حبس بیجا میں رکھا اور ان پر تشدد کیا ۔ وزیر علی کھوسو اور جمعہ کھوسو کو بھی بیدخل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مزاحمت کر رہے ہیں ۔ ان ہاریوں کے علاوہ تین ہاریوں کی چار چار ایکڑ زمین بھی چھین لی گئی ہے ۔ ہاریوں نے رپورٹیں درج کرانے کی کوششیں کیں لیکن کچھ نہ ہوا

۱۲۔ ایکڑ زمین پر کھڑی فصل ٹریکٹر چلا کر تباہ کر دی گئی

مختار کار نے ہاریوں کو ان کا ہارپ سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کیا ہوا ہے اور انہیں انکا سروے نمبر بھی بتانے پر تیار نہیں ہے۔

جن چھوٹے مالک کسانوں کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا ہے ان میں شمشاد علی خاں کی دیہہ فتح پور میں ۱۴ ایکڑ زمین ہے۔ اس کے علاوہ ۱۵ ایکڑ زمین الگ ہے۔ محمد ماچھی کی ۸ ایکڑ زمین ہے۔ گوٹھ ہلادل کھوسو کے ہاری بھی اپنی زمینوں سے اور گوٹھ سے بیدخلی کے خلاف آخر دم تک مزاحمت کرنے کا عزم رکھتے ہیں

دیہہ بارو دری، گلاڑچی

دیہہ بارو دری تعلقہ گلاڑچی کے تنکاری، ہاریوں پولیس حوالات میں بند کر کے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، پولیس کی مدد سے ان کے بال بچوں کو بزور قوت گھروں سے بے دخل کر دیا گیا ہے اور ان کے گھروں پر ٹریکٹر چلا کر انہیں مسمار کر دیا گیا ہے۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء میں ایوبی زرعی اصلاحات میں ٹریکٹر اسکیم کے تحت اس علاقے میں غیر آباد زمینیں مذکورہ ہاریوں کی زیر کاشت زمینوں سمیت ۵۰۰ ایکڑ زمین ملتان کے نواز پاشا کو دی گئی تھی۔ نواز پاشا نے ۱۹۷۱ء میں یہ زمین مردان کے علی خاں پٹھان کو فروخت کر دی اس زمین نے یہ زمین ایک بار پھر ۱۹۷۳ء میں ملک حیات کو فروخت کر دی

زمین کی اس فروخت پر ہاری خمیو تنکاری اور بچایو تنکاری کے علاوہ نو دیگر کسانوں نے ریونیو افسر کے پاس درخواست داخل کر کے اس فروخت کو اس وقت کے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے تحت چیلنج کیا تھا۔ اسی دوران ملک حیات نے بدمعاشوں اور پانھار بداروں کے ذریعے ہاریوں کو بیدخل کرنے کی کوشش کی۔

ہاریوں نے مختار کار کے پاس بیدخلی کے خلاف مقدمہ درج کیا۔ مختار کار نے ۱۴ سے ۱۵ برس سے مسلسل کاشت کرتے والے ان ہاریوں کا حق مزارعیت تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ انہیں بیدخل نہیں کیا جائے گا۔ اسی فیصلے کی رو سے کمشنر حیدر آباد نے ٹریکٹر اسکیم کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر اس زمین کا الاٹمنٹ منسوخ کر دیا اور فیصلہ کیا کہ اس زمین کو مقامی کسانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

دوسری جانب مختار کار کے فیصلے کے خلاف زمیندار نے اسسٹنٹ کمشنر بدین کے پاس مقدمہ درج کیا ۔۔۔ اس نے مختار کار کے مذکورہ بالا فیصلے کو رد کر دیا اور پولیس کی مدد سے ہاریوں کو زبردستی بیدخل کرنے کا حکم دے دیا ۲۵-۳۰ ہاریوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور دوسروں کے وارنٹ جاری کر دیئے

اس صورت حال میں گرد و نواح کے کسانوں نے اپنے طبقاتی اتحاد کا ثبوت دیتے ہوئے بیدخلی کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ اس مزاحمت میں عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ اس کے نتیجے میں پولیس اور انتظامیہ بھی ہاریوں کو بیدخل نہ کر سکی۔

کسانوں نے ۔۔۔ بدین کے پاس اسسٹنٹ کمشنر کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی ۔۔۔ نے ہاریوں کے حق کو تسلیم کیا۔ زمیندار نے اس کے مقابلے میں کمشنر کے فیصلے کے خلاف بورڈ آف ریونیو میں مقدمہ داخل کیا۔ بورڈ کے ایک رکن نے متنازعہ علاقے میں جا کر سماعت کی اس نے اپنی سفارشات کے ساتھ کہیں واپس کمشنر کو بھیج دیا جہاں یہ مقدمہ ابھی تک زیر سماعت ہے۔

اس دوران خمیو تنکاری کو جھوٹے مقدموں میں ملوث کر کے بار بار جیل بھیجا گیا۔ موجودہ مارشل لاء لگنے کے بعد خمیو تنکاری کو تین ماہ کے لئے سکھر جیل میں نظر بند کر دیا گیا اور باقی ہاریوں پر یکطرفہ طور پر ۱۸ ہزار روپے جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ غریب ہاری یہ بھاری جرمانہ ادا نہ کر پائے اور اس جرم میں انہیں اور جیل سے رہا ہونے کے بعد خمیو تنکاری کو بھی پولیس حوالات میں رکھ کر ان پر سخت تشدد کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ہاریوں کی جبری بیدخلی کر دی گئی ہے۔

ہاریوں کی حمایت کرنے کے جرم میں ہاری رہنما محمد فاضل راہو کو بدین کی سرسری فوجی عدالت نے ایک سال قید بامشقت، ۵ کوڑوں اور ۵۰۰۰ روپے (پانچ ہزار) روپے جرمانے کی سزا سنادی ہے۔

OO

پیکنگ میں پاکستانی بیڈمنٹن ٹیم صرف

کانسی کا تمغہ حاصل کرسکی

پیکنگ سے

عبدالوحید الحسینی

کی خصوصی رپورٹ

پیکنگ میں گذشتہ ماہ منعقد ہونے والے تیسرے ایشین انویٹیشن بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے مینز ڈبلز مقابلوں میں پاکستانی کھلاڑیوں کا تیسری پوزیشن حاصل کر لینا بلاشبہ ایک بڑی اور حوصلہ افزا کامیابی ہے۔

جاوید اقبال اور طارق ودود نے سنگاپور کے تان اینگ

ٹیم کے مینیجر ایس-ایم ذکی
چین کے اسپورٹ منسٹر وانگ منگ اور آرگنائزنگ کمیٹی کے وائس چیئرمین چوژنی۔

طارق ودود اور
جاوید اقبال پیکنگ میں
سنگاپور کے خلاف میچ کھیلتے ہوئے۔
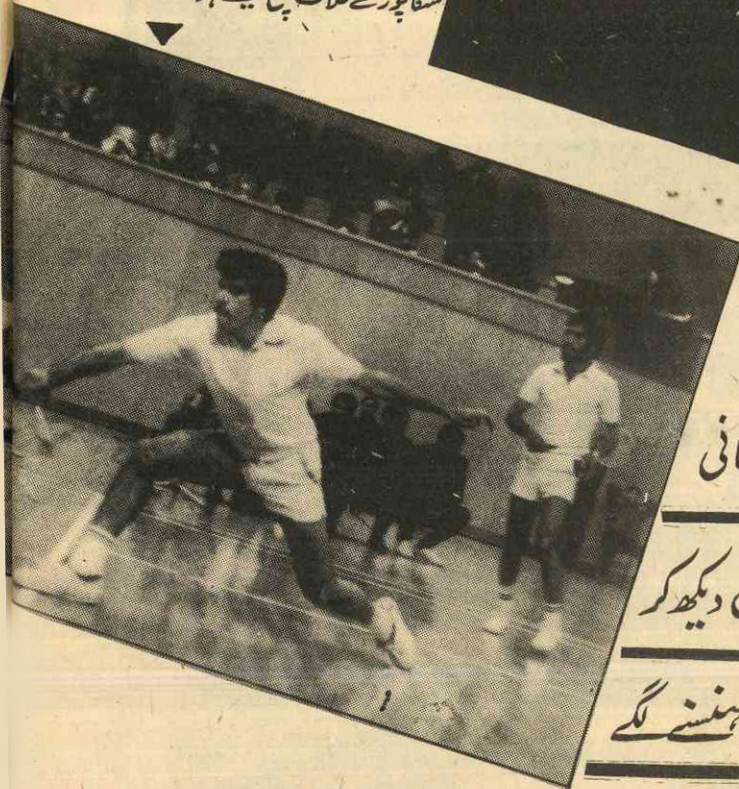
جونیئر ٹیم کے پاکستانی کھلاڑیوں کا کھیل دیکھ کر تماشائی ہنسنے لگے

اور کاک پینگ کو ۱۳-۱۸، ۱۵-۹ ، ۹-۱۵ سے شکست دیکر کانسی کا تمغہ جیتا۔ بین الاقوامی ٹورنامنٹس میں یہ پہلی قابلِ ذکر اور نمایاں کامیابی تھی۔ جو پاکستان کے حصے میں آئی گو کہ ہمارے بیڈمنٹن کے کھلاڑی ایک طویل عرصے سے مختلف ایشیائی اور عالمی مقابلوں میں شرکت کرتے رہے لیکن سیمی فائنل میں پہنچنے کا اعزاز پہلی بار صرف جاوید اقبال اور طارق ودود کو ہی حاصل ہو سکا۔

پیکنگ چیمپئن شپ میں ۱۲ ممالک کے ۹۴ کھلاڑی کھیل رہے تھے۔ جس میں ۲۶ لڑکیاں شامل تھیں زیادہ تر ٹائیٹل چین کے جسمانی طور پر بے حد صحت مند کھلاڑیوں کے حصے میں آئے۔ لیکن لیڈیز ڈبلز تھائی لینڈ کی لڑکیاں جیت گئیں جب کہ بوائز ڈبلز کا گولڈ میڈل برما کو ملا۔

سب سے سخت مقابلہ مینز سنگلز میں ہوا۔ جہاں چین کے یویاؤ ننگ نے اپنے ہم وطن چن تن لنگ کو ہرا کر اپنا اعزاز برقرار رکھا۔ مینز ڈبلز کے سیمی فائنل میں پہنچنے والی ٹیموں کا تعلق چین۔ انڈیا، سنگاپور اور پاکستان سے تھا۔ چین کے تانگ سین ہو۔ اور لن شی جوان نے جاوید اور طارق کو ۸-۱۵، ۱۲-۱۵ سے ہرا دیا۔ دوسرے سیمی فائنل میں انڈیا کے پرکاش اور سید مہدی نے سنگاپور کے کھلاڑیوں کو ۵-۱۵، ۱۰-۱۵ سے شکست دی فائنل میں بھارتی کھلاڑی تانگ سین اور لن شی کے جارحانہ کھیل کا مقابلہ نہ کر سکے اور ۵-۱۵، ۳-۱۵ کے اسکور پر ہار گئے

تیسری پوزیشن کے لئے سنگاپور اور پاکستان میں مقابلہ ہوا۔ جاوید اقبال نے جنہیں چینی کھلاڑی اور تماشائی پیار سے بگ بیرڈ" (لمبی داڑھی والا) کہتے تھے طارق کے ساتھ بہترین کمبی نیشن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تانگ اینگ اور کاک پینگ کو قدم جمانے کا موقع دیئے بغیر پہلا گیم ۹-۱۵ پر جیت لیا۔ دوسرے گیم میں طارق کے دائیں ہاتھ میں شدید تکلیف ہونے لگی اور باوجود مدافعتی کھیل کے پاکستانی ۹-۱۵ پر ہار گئے۔ تیسرے فیصلہ کن گیم میں جاوید نے طارق کو مستقل طور پر کور کئے رکھا اور اپنی زور دار اسمیشز کے ذریعے ۱۳-۱۸ پر مخالف کھلاڑیوں کو ہرا کر میچ اور کانسی کا تمغہ جیت لیا۔ دراصل یہ تمغہ حاصل کرنے کا سہرا صرف جاوید اقبال کے سر ہے۔ جنہوں نے پورے کھیل میں اپنی طاقت ور اسمیشز اور چکرا دینے والے ڈراپس کے ذریعے مخالفوں کو پریشان کئے رکھا۔

ٹیم کے پاکستانی کوچ نے اپنا تمام وقت دعوتوں اور شاپنگ میں گزارا

پیپلز ڈیلی نے جاوید اقبال اور طارق وودد کی تین کالمی تصویر شائع کی اور ان کے شاندار کھیل کو سراہا۔
فی الحقیقت جاوید اقبال اپنی خوبصورت گھنی سیاہ داڑھی کے باعث کیپٹل انڈور اسٹیڈیم میں موجود تمام کھلاڑیوں اور ۱۸ ہزار تماشائیوں میں ممتاز نظر آتے تھے ان کو دیکھ کر چینی تماشائی نعرہ لگاتے "وہ دیکھو بگ بیرڈ آگیا" جاوید اقبال نے انتہائی مشکل ترین صورت حال کے باوجود ٹیم کے ساتھ پیکنگ آنے کا فیصلہ کیا تھا چین روانگی سے دو دن قبل انہیں اطلاع ملی کہ ان کے بہنوئی حسن کی عمر صرف ۳۲ سال تھی سعودی عرب میں انتقال کر گئے ہیں ایسی صورت میں جب کہ میت ابھی سعودی عرب سے آئی نہ تھی ان کی ٹیم کے ساتھ روانگی بے حد دشوار نظر آتی تھی۔ لیکن بیڈمنٹن فیڈریشن کے عہدیداران کی درخواست پر جاوید کے والد نے فیصلہ کیا انہیں چین ضرور جانا چاہیئے یہ فیصلہ ہر چند کہ بڑا ہی تکلیف دہ تھا لیکن اگر جاوید پیکنگ نہ جاتے تو پاکستان کانسی کا میڈل بھی نہ جیتتا ایشین چیمپئن شپ کے اختتام پر جاوید وطن واپس چلے گئے۔ ٹیم نے بعد ازاں شنگھائی نان کنگ اور ہانگ چو کا ۱۱ روزہ دورہ کیا اور ایک بھی میچ جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکی جاوید کی بجائے حسن شہید طارق کے ساتھ ان میچز میں ڈبلز کھیلے لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ جو جاوید کے کھیل میں تھی۔

ایشین چیمپئن شپ کے دوران پاکستان

ایشین چیمپئن شپ کے دوران پاکستان کھلاڑیوں کو دیگر ممالک کے کھلاڑیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد واضح ہوا کہ ابھی انہیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور بے حد محنت کرنی ہے۔ فزیکل فٹنس میں پاکستانی کھلاڑی ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والے بیشتر کھلاڑیوں سے کم تر تھے۔ ان کے کھیل کا موجودہ معیار بھی ان چینی کوچز کا مرہون منت ہے جو گذشتہ سالوں میں پاکستان آ کر انہیں تربیت دیتے رہے ہیں۔ چینی ٹیمیں گذشتہ سالوں میں پاکستان آتی رہی ہیں اور بعض اوقات پاکستانی کھلاڑیوں نے انہیں ہرایا بھی ہے لیکن انہی کھلاڑیوں کو پیکنگ میں کھیلتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ان کے کھیل کا معیار قابل تعریف حد تک بلند ہو چکا تھا جب کہ پاکستانی کھلاڑی روبہ تنزل تھے۔ سنگلز کے مقابلوں میں جاوید، طارق، حسن شہید اور زبیر بری کوارٹر فائنلز تک بمشکل پہنچ سکے۔ نزمی چیمپئن عصمت سعید اور نزہت صدیقی کا کہیں شمار ہی نہ تھا۔ جونیئرز شفیق، لیاقت گوہر اور منیر کے کھیل کو دیکھ کر تماشائی ہنستے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں زیادہ ہنسنے کا موقع نہ ملا کیونکہ کوالیفائنگ راؤنڈ میں ہی جونیئرز اپنے جوہر دکھلا کر رخصت ہو گئے حیرت کی بات ہے کہ فیڈریشن نے آفرکس بنیاد پر ان کا انتخاب کیا تھا۔ ٹورنامنٹ کے رولز کے مطابق جونیئرز میں صرف ۱۸ سال سے کم عمر کے کھلاڑی کھیل سکتے تھے جبکہ شفیق، گوہر اور لیاقت کے چہروں پر محض ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کم از کم ۲۴ سال کے ہیں۔ صرف منیر کی عمر ۱۸ سال سے کم نظر آتی تھی۔ ٹورنامنٹ میں تو یہ کوالیفائنگ راؤنڈ سے باہر نہ جا سکے لیکن شنگھائی، نان کنگ اور ہانگ چو کے دورے میں بھی ان کی کارکردگی شرمندگی کا باعث بنتی رہی۔

عصمت سعید نان کنگ کے پہلے میچ میں گھٹنے پر چوٹ لگ جانے کے باعث بقیہ دورے میں کھیل نہ سکیں۔ تقریباً یہی حال طارق وودد کا تھا جن کے ہاتھ میں مستقل درد رہا اور وہ اس کھیل کا مظاہرہ نہ کر سکے جس کی ان سے توقع کی جا رہی تھی اور اگر چینی کوچ چیانگ یونگ ای ٹیم کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید سینئر کھلاڑیوں کا کھیلنا محال تھا۔ چیانگ نے جس طرح ان کھلاڑیوں کی خدمت کی ہے اس کی مثال پاکستان میں ملنا مشکل ہے۔ ہر میچ سے پہلے چیانگ ان کے رگ پٹھوں کی مالش کرتے انہیں مخالف کھلاڑی کے کمزور پوائنٹس بتاتے اور دوران کھیل ان کے ٹوٹے ہوئے گٹس کی مرمت کرتے تھے۔ میچ ختم ہونے کے بعد بھی ان کا یہی معمول ہوتا تھا۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ پاکستانی کوچ عظیم واسطی ان سب خدمات کو دیکھ کر سوائے مسکرانے کے کچھ اور نہ کر سکے۔ پورے

ٹورنامنٹ اور ٹور کے دوران ایک بار بھی انہوں نے کسی کھلاڑی کو اپنی توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ میچ کے دوران کھلاڑیوں کے لئے پانی اور تولیہ بھی یا تو چینی کوچ لاتا تھا یا جونیئرز یہ خدمات انجام دیتے تھے۔

پاکستانی کوچ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ریکٹ گٹ کیسے کئے جاتے ہیں۔ میچ سے قبل مختلف کھلاڑیوں کے فکسچرز کا بھی انہیں علم نہ ہوتا تھا۔ ٹورنامنٹ کے دوران انہوں نے ایک دن شفیق اور گوہر سے پوچھا کہ ان کا میچ کب ہے حالانکہ ان دونوں کو میچ ہارے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

چیمپئن شپ کے ساتویں دن پاکستانی کوچ نے یا تو کھلاڑیوں کی تصاویر اتاریں یا ان سے دوستی بڑھانے میں مصروف رہے۔ چیمپئن شپ کے بعد جو وقت بچتا تھا اس کا بھی بڑا معقول انتظام ان کے پاس تھا۔ پاکستان سے وہ ایک لمبی شاپنگ لسٹ لائے تھے اور اکثر اسی الجھن میں حیران و پریشان نظر آتے تھے کہ کس طرح فرینڈشپ اسٹور پر زیادہ سے زیادہ وقت گذارا جائے۔ خصوصاً لیڈیز ان کے عامیانہ مذاق اور لچر گفتگو سے بے حد تنگ آ گئی تھیں لیکن نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے باعث انہیں برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ بارہا ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی گئی کہ ٹیم کو صبح میں پی ٹی اور مختلف ورزشیں کروانا ضروری ہے۔ لیکن ان کے کان پر جوں نہ رینگی۔ جونیئرز پر وہ بے حد برافروختہ تھے اور ان کے سلیکشن پر فیڈریشن کے عہدیداروں اور سلیکٹرز کو بے نقط سناتے تھے لیکن جب ان سے کہا گیا کہ اب دورے میں تو ان جونیئرز کی کوچنگ پر توجہ دیں تو موصوف کہتے تھے کہ ان پر محنت کرنا فضول ہے۔

ہم اسپورٹس بورڈ اور بیڈمنٹن فیڈریشن کے حکام سے گذارش کریں گے کہ آئندہ کوچز کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ پاکستانی کوچ کی دورے میں ضرورت ہی نہ تھی۔ چینی کوچ کے ہوتے ہوئے پاکستانی کوچ کو دورے پر بھیجنا محض پیسے کا اسراف ہے۔ اگر ٹیم مینیجر ذکی صبر و تحمل اور دور اندیشی سے کام نہ لیتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ پاکستانی

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

بقیہ :۔ صورتحال

صاحب بھی امریکہ اور مغرب پر زیادہ انحصار کر کے عوام کے مسائل کو حل نہیں کر سکے تھے، اس لئے وقتی طور پر عوام میں مقبولیت کھو بیٹھے تھے، لیکن ان کے بعد آنے والے حکمراں بھی امریکہ اور عرب ممالک میں امریکہ کے حامی ملکوں پر اعتماد کر کے عوام کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ مقبولیت اور نفرت میں سر فہرست سبب عوام کے مسائل سے دلچسپی یا عدم دلچسپی ہی ہوتا ہے۔

اس وقت کچھ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کو پھر مغرب کی طرف دھکیلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سنٹو کو سرگرم کیا جا رہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ سے رابطے قائم ہو رہے ہیں۔ پھر زوروں پر ہے بھوک بیروزگاری رہائش اور دوسرے عوامی مسائل کے ذکر کی بجائے کمیونزم کو روکنے کا شور ہے۔ اسلام کا نام لے کر اپنا الو سیدھا کیا جا رہا ہے۔ یہ صورتحال بڑی خطرناک ہے، امریکہ کی گود میں ہم نے کئی برس رہ کر دیکھ لیا ہے نازک وقت پر امریکہ نے ہمیشہ ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ دنیا میں دوسرے مقامات پر بھی دیکھ لیں کہ امریکہ کے دوستوں کا کیا انجام ہوا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ کسی طاقت کو بھی ناراض نہ کیا جائے۔ تینوں طاقتوں امریکہ روس اور چین سے تعلقات میں ایک توازن کی ضرورت ہے، پھر چین اور روس تو ہماری پڑوسی طاقتیں ہیں، ان سے دوستی میں، تجارت میں، فائدے ہیں۔ نزدیک ہونے کے باعث اخراجات بھی کم ہوتے ہیں، دونوں ایشیائی طاقتیں بھی ہیں، ان سے دشمنی میں خطرے ہی خطرے ہیں۔

اس وقت جو سیاسی رہنما، اور اخبارات و رسائل ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ وہ بلا وجہ روس اور پاکستان میں غلط فہمیاں پیدا کریں، ان کا آپ اچھی طرح تجزیہ کریں، تو وہ سب قیام پاکستان کے مخالفین میں سے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد سے وہ استحکام پاکستان کے سرگرم مخالف چلے آ رہے ہیں، ان بیانات میں بھی وہ بالواسطہ استحکام پاکستان کے خلاف اپنی خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

رابطہ عالم اسلامی نام کی ایک تنظیم کی سرگرمیاں بھی پاکستان میں بہت تیز ہو گئی ہیں۔ ایشیائی اسلامی سربراہ کانفرنس کراچی میں اس تنظیم کے تحت منعقد کی جا رہی ہے، حالانکہ اسلامی سربراہ کانفرنس کا سیکرٹیریٹ موجود ہے۔ یہ کانفرنس اس کے تحت بھی ہو سکتی تھی۔ پھر مسلمان سربراہوں کو ایشیا، افریقہ میں تقسیم کرنے سے ہم عالم اسلام کو تقسیم کے گنہ گار ہو جائیں گے، ایسی کانفرنس کیا ہوگی، جس میں لیبیا مصر، سوڈان، نائیجیریا، ماریطانیہ، یوگنڈا، نائیجر اور کئی مسلمان افریقی ممالک شریک نہیں ہونگے پھر لیبیا کی عدم شرکت آج کل کے حالات میں انتہائی معنی خیز ہو سکتی ہے۔

ایسے معاملات میں انتہائی پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے، اسلامی ممالک اپنا ایک سیکرٹیریٹ قائم کر چکے ہیں۔ اسلئے اب ساری اجتماعی کوششیں اس ایک پلیٹ فارم سے ہونی چاہئیں، کسی دوسری تنظیم کے ذریعے ایسی کوششیں شکوک و شبہات پیدا کر سکتی ہیں، کوئی غیر سیاسی یا مذہبی اجتماع ہو تو کسی دوسری تنظیم کے تحت بے شک ہو سکتا ہے۔

ہم اس وقت چوراہے بلکہ ہشت راہے پر کھڑے ہیں۔ صحیح راستے کا انتخاب اور اس انتخاب کو بھرپور حمایت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ راستہ عوام کی مرضی سے چنا جائے۔

ہمارے چاروں طرف جو تیز رفتار تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں کوئی فعال سیاسی قیادت موجود ہو، منتخب سیاسی حکومت کا قیام انتہائی ضروری ہے، قومی حکومت کے قیام سے سیاسی رہنماؤں سے مذاکرات سے یا مسٹر بھٹو سے مصالحت سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا، ملک میں سیاسی کشیدگی ختم کر کے آزادانہ انتخابات کروا دیئے جائیں، فوجوں کو اپنی حقیقی ذمہ داری پر بھیج دیا جائے۔ کیونکہ ملک کی سرحدوں کا دفاع سیاسی کشیدگی سے مبرا فوج ہی کر سکتی ہے۔

فلم
ریڈیو ٹی وی
زاروف کی
رپورٹ
تمام معاملات خوش
اسلوبی سے نمٹا گئے
شاہد
جب بابرا شریف اور شاہد حمید
سے جیٹ پاؤڈر والی
خاتین کراچی میں خفیہ طور پر شادی کے بعد لندن میں
ہنی مون منا کر وطن واپس لوٹے ہیں مسلسل خبروں کا
موضوع بن رہے ہیں۔
نیا فلمی شادی شدہ جوڑا جب اچانک غائب

انکم ٹیکس والے
فردوس پر رحم نہیں کر سکتے؟

ہو کر لندن پہنچ گیا تھا تو کئی فلمساز اور ہدایت کار بہت سیخ پا ہوئے تھے کہ اُن کی زیر تکمیل فلمیں متاثر ہو رہی تھیں۔ ایک ایکشن کمیٹی بنائی گئی جس کے کئی اجلاس ہوئے اور جس نے حکومت کو یہ تجویز بھی پیش کر دی کہ فنکاروں کو بیرون ملک جانے کے لئے این او سی دینے سے پہلے فلمسازوں کی انجمن سے مشورہ کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ یہ تجویز بھی زیر غور آئی کہ دونوں فنکاروں کا بائیکاٹ کر دیا جائے اور نہ جانے کن کن تجاویز پر غور ہوتا رہا۔

پھر سننے میں آیا کہ بابرا اور شاہد وطن واپس لوٹ آئے ہیں۔ ہوائی اڈے سے بابرا کی بہن فاخرہ شاہد کو اپنے گھر لے گئیں اور اُن کی واپسی کے ساتھ ہی فلمسازوں کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا کہ اُن کا بائیکاٹ کر کے کوئی بھی مالی نقصان دکھانے کے لئے تیار نہ تھا کہ زیر تکمیل فلموں کے کئی مناظر نئے اداکاروں کے ساتھ دوبارہ عکس بند کرتے۔ اُدھر بابرا اور شاہد نے یہ چال چلی کہ قومی فلمی صنعت سے معذرت کر لی اور جن فلمسازوں کو اُن کی اچانک غیر حاضری کے باعث مالی نقصان اُٹھانا پڑا تھا وہ بھی پورا کرنے کی حامی بھر لی اور یوں انہوں نے اپنی اپنی زیر تکمیل فلموں میں دوبارہ کام شروع کر دیا۔

اس دوران شاہد کی پہلی تین بیویوں منزہ، زمرد، اور عشرت چوہدری کا بار بار ذکر آتا رہا کہ بابرا کے آنے کے بعد اُن کا مستقبل کیا ہو گا بعض حلقوں کا خیال تھا کہ منزہ اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے اور زمرد شاہد کے ساتھ اپنے لگاؤ کے باعث اس سارے جور و ستم کو خاموشی سے برداشت کر لیں گی لیکن خطرہ اصل تو تھا عشرت چوہدری کی طرف سے کہ وہ رقاصہ کے ساتھ ساتھ ایکشن فلموں میں اداکاری کرتے کرتے خود بھی کافی ایکشن ایبل ہو چکی تھیں۔ اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا یعنی انہوں نے ایک پمفلٹ کی صورت میں شاہد کو اُن کی نئی شادی کا تحفہ دیا۔

شاہد صاحب نے بابرا کے ہمراہ کراچی میں ایک پریس کانفرنس کر کے سارے معاملے کا ڈراپ سین کر دیا ہے۔ پہلی بیویوں کو طلاق دینے کی اطلاع بھی دی ہے۔ ساتھ ہی عشرت چوہدری کو سابق بیویوں کی فہرست سے نکال دیا ہے اور یوں بابرا کی راہ کے کانٹے بظاہر ایک ایک کر کے نکل گئے ہیں۔

ویسے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاہد اپنے محسن و مربی ہدایت کار حسن طارق کے نقش قدم پر بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں جنہوں نے بڑی کامیابی سے طلاق و شادی کا تسلسل جاری رکھا۔

توہم پرستی اور فلمی لوگ

توہم پرستی کے شکار لوگ تیرہ تاریخ کو بہت منحوس سمجھتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ توہم پرستی کا عمل دخل ہماری فلمی دنیا میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن ۱۳ کی نحوست سے سابقہ اداکارہ فردوس بال بال بچ گئیں اگرچہ یہ اطمینان فی الوقت عارضی ہے۔

تیرہ اپریل کو محکمہ انکم ٹیکس کے حکام نے لاہور کے ماڈرن علاقے گلبرگ ۳ میں واقع فردوس کی کوٹھی اور اس کی ملکیت فردوس مارکیٹ کو نیلام کرنا تھا تاکہ اس سے کئی سال پرانے انکم ٹیکس کے بقایا جات وصول کئے جا سکیں جن کی مجموعی رقم گیارہ لاکھ روپے بنتی ہے لیکن فردوس کو سول جج کی عدالت سے حکم امتناعی مل گیا اور یوں تیرہ تاریخ کی نحوست کی گھڑی ٹل گئی۔ فردوس نے اس سے پہلے انکم ٹیکس والوں کو درخواست دی تھی کہ اس سے بقایا جات قسطوں میں وصول کئے جائیں لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی تھی اور اس کے بعد نیلامی کا چکر شروع ہو گیا تھا۔

فردوس پچھلے چھ سات سال سے فلموں سے غیر حاضر ہے اداکار و فلمساز اعجاز درانی کی "بے وفائی" نے اسے نشہ کی دنیا میں دھکیل دیا اور نشہ کی لت نے اسے فلموں سے نکال باہر کیا کچھ عرصہ پہلے اس نے کیریکٹر ایکٹنگ کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش آغاز میں ہی ناکام ہو گئی۔

کسی اور نے تو اپنے وقت کی مقبول ترین ہیروئن پر ترس نہیں کھایا لیکن محکمہ انکم ٹیکس والوں کو تو اتنا ظالم نہیں ہونا چاہیئے۔ آخر پوری فلمی صنعت نادہندگان سے بھری پڑی ہے انہیں کیا ایک مرا ہوا شکار ہی مارنے کے لئے ملا تھا۔

سننے میں تو آ رہا ہے کہ محکمہ انکم ٹیکس والے اس مرتبہ کسی نادہندہ کو بخشنے کے موڈ میں نہیں ہیں اس لئے جتنی جلد لاکھوں روپے کے بقایا جات ادا ہو جائیں اتنا ہی فلمی فنکاروں کے اپنے حق میں بہتر ہو گا۔

OO

طارق عزیز پنجابی نظموں کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں

پاکستان ٹیلی ویژن کے مائیکرو ویو سسٹم کی خرابی کے سبب ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کو بہ یک وقت دکھائے جانے والے پروگراموں کی پیش کش میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آج کل ایسے تمام پروگراموں کی کئی فلمیں تیار کرنے کے بعد انہیں بذریعہ پی آئی اے بھیجا جاتا ہے اس بھاگ دوڑ میں چند لمحوں کی تاخیر بھی نو کریوں کی بقا کا سوال بن جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ کے مختلف کرداروں پر مشتمل سیریز آبگینے تقریباً آٹھ ماہ جاری رہنے کے بعد اختتام کو پہنچ گئی اس سیریز کی مختلف قسطوں میں تقریباً چار سو چھوٹے بڑے اداکاروں نے کام کیا۔ جن میں آدھے سے زیادہ نئے چہرے ہیں اس کے باوجود اداکاروں کی کمی رہی اور بعد کی قسطوں میں چہروں کو دہرایا گیا۔

کراچی اسٹیشن سے نئی سیریز بنام محور شروع ہو رہی ہے۔ اس میں مختلف پیشوں میں کام کرنے والے لوگوں کو ڈرامے کا موضوع بنایا جائے گا۔ ہر قسط میں نیا ڈرامہ ہوگا۔ سیریز بیگم ہوگی اسے پیش کریں گے باری باری محسن علی، شبیر خان اور قاسم جلالی۔

ضیا محی الدین والی ناہید! جن کے متعلق پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ فن کی ناقدری سے دل برداشتہ ہو کر بمعہ شوہر لندن چلی گئی ہیں۔ ان کی وطن واپسی کب ہوئی۔ یہ تو معلوم نہیں البتہ چھوٹے سکرین پر وہ پھر آگئیں ہیں۔ باوجود ڈھیروں شکایتوں اور شکووں کے۔

حیران پریشان آنکھوں والی شائستہ قیصر نے پچھلے دنوں اپنی شادی کی خبر کی سختی سے تردید کرتے ہوئے اسے دشمنوں کی ہوائی قرار دیا تھا۔ لیکن فہمیدہ نسرین کے ولیمے میں وہ جس اہتمام سے آئی تھیں۔ اس نے لوگوں کی زبانوں کو پھر سے بے لگام کر دیا ہے۔

بہر حال ہیں خوش رہنے والے طارق عزیز آج کل سنجیدگی سے اپنی شاعری کا پنجابی مجموعہ کلام مکمل کرنے میں مصروف ہیں۔

کراچی اسٹیشن سے زیر عتاب آنے والوں میں نمایاں نام طارق فتح اور تنویر احمد کے ہیں۔ موجودہ حالات میں دونوں حضرات اس مثال کا شکار ہوئے ہیں کہ "کرے کوئی بھرے کوئی"۔ سابقہ حکومت کے دور میں سینے ٹھونک ٹھونک کر وفاداریوں کا اعلان کرنے والوں کے آج کل نہ صرف سینے بند ہیں بلکہ زبان بھی بند ہے کہ ان کی وفاداریوں کے رخ بدل چکے ہیں۔ کاش طارق فتح اور دوسرے سابقہ حکومت ہی کی حمایت کی ہوتی تو آج نکالے جانے کا دکھ یوں نہ ہوتا۔

OO

شائستہ قیصر

کی شادی کی افواہیں

پھر گردش کر رہی ہیں

بقیہ :- سنٹو

پاکستان کے بارے میں سنٹو کا جو کارنامہ بتایا گیا ہے وہ ایک بہت خطرناک انکشاف ہے۔ اس کی وضاحت ضروری ہے کہ پاکستان کو مغرب سے مزید کٹ جانے سے سنٹو نے کس طرح روکا ہے۔ کیا اسلامی ملکوں میں اس کا فعال کردار ختم کر کے، تیسری دنیا کی ترجمانی کا شرف چھین کر یا کس طرح اسے مغرب سے دور ہونے سے روکا گیا۔ اس کا کس پیریڈ کی طرف اشارہ ہے۔ پاکستان کے عوام کو اس بیان پر یقیناً تعجب ہوا ہے۔ یہ برطانوی وزیر خارجہ کا بیان ہے۔ اور سنٹو کے وزارتی اجلاس کے بعد جاری ہوا ہے، اس لئے اسے یونہی نظر انداز نہیں کیا جا جا سکتا۔ اس بیان کا تفصیلی تجزیہ تو کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے سیاسی اور غیر سیاسی دور کے واقعات اور بیانات کا موازنہ کیا جائے لیکن ابھی اس لمحے قلم کو دوات میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ وقت گزر جائے گا۔ مگر قلم تباہ ہو گا اور نہ سیاہی خشک ہو گی۔ مگر کیا اعتراف ہے اور کیا دیدہ دلیری۔

برطانیہ کے لئے سنٹو کی افادیت کہ وہ ایران کے لئے اسلحہ فراہم کرنے والا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ورنہ برطانیہ کی خوشحالی پر سخت اثر پڑتا۔ کتنا خود غرضانہ رویہ ہے۔

سنٹو کے اجلاس میں سابق وزیر اعظم بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت زیر غور نہ آنا مسٹر بھٹو کے حق میں جاتا ہے جس سے جہاں سنٹو کا رخ کردار واضح ہوتا ہے وہاں مسٹر بھٹو کا آزادانہ کردار بھی سامنے آتا ہے جب پوری دنیا نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے سنٹو کے وزارتی اجلاس میں اس مسئلے کا زیر غور نہ آنا ہی پاکستان کے عوام کے لئے سنٹو کی اہمیت اجاگر کر دیتا ہے۔

بقیہ :- کھیل

کو مچ اپنی چھچھوری حرکات سے ٹیم اور ملک کے لئے مستقل پریشانی اور شرمندگی کا باعث بن جاتے۔ اعلیٰ کارکردگی کا معیار چینیوں نے پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تمام میچز وقت پر ہوئے۔ کسی بھی کھلاڑی کو ذرا سی بھی شکایت کا موقعہ نہ ملا۔ پاکستانی ٹیم کی رہائش اور دیگر سہولتوں کا انتظام وی آئی پی اسٹائل کا تھا۔ دورے میں ہر جگہ ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ میزبانوں نے اپنے اپنے علاقوں کی تاریخی عمارات اور تفریحی مقامات کا دورہ کروایا پیکنگ میں ٹیم نے دیوار چین دیکھی اور ماؤزے تنگ کے جسد خاکی کو شیشے کے تابوت میں بند دیکھا۔ وطن واپسی پر ٹیم کو رخصت کرنے والوں میں آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکرٹری، آل چائنا اسپورٹس فیڈریشن کے حکام، چینی کھلاڑی اور پاکستانی سفارتخانے کے حکام شامل تھے۔

بقیہ :- شملہ معاہدہ

کہتے اور نہ ہی بھٹو کی اپیل پر مقبوضہ کشمیر میں شالی ہڑتال ہوتی یاد رہے کہ بھٹو نے آزادیٔ کشمیر کے لئے عالمی رائے عامہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے کشمیریوں کو ہڑتال کی اپیل اس وقت کی تھی جب شملہ معاہدہ طے پا چکا تھا۔ اگر کوئی خفیہ معاہدہ ہوا ہوتا تو نہ بھٹو ہڑتال کی اپیل کرتا اور نہ وہ کامیاب ہوتی۔ بھارت نے تو کشمیر کو صوبہ بنا لیا ہے مگر پاکستان میں کشمیر کی حیثیت ایک خود مختار علاقے کے طور پر آج بھی بحال ہے پھر یہ الزام کیسے صحیح ہے کہ بھٹو نے کشمیر کی کنٹرول لائن کو مستقل سرحد مان لیا تھا۔ یہ محض پاکستان کی عظیم سفارتی فتح کو شکست میں بدلنے کی ایک سازش ہے۔

جنرل ضیا کے بھارت کے دورہ سے پہلے ہی پاکستان میں ان کی حمایت کے دعویدار اخبارات جنگ۔ نوائے وقت اور جسارت وغیرہ نے انتہائی ہوشیاری اور چالاکی سے ان کے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں "بغلگیر ہوتے وقت پیٹھ میں چھری گھونپنا"۔ عجیب بات ہے کہ آج پاکستان کے وقار کو مجروح کیا جا رہا ہے اور مارشل لاء کے اس ضابطے کے باوجود کہ پاکستان کی سالمیت اور وقار کے خلاف کسی لفظ کی اشاعت برداشت نہیں کی جائے گی جو بھٹو کے حق میں لکھے وہ اخبار تو مجرم ہے لیکن جو پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں وہ بے لگام ہیں۔ آج انصاف کا یہ دوہرا معیار پاکستان کے وجود کی قیمت پر کیوں برقرار رکھا جا رہا ہے۔

اگر حکومت خاموش رہتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خفیہ مفاہمت سے باخبر بھی ہے اور اس سے اتفاق بھی کرتی ہے اور اس کے نتائج کی ذمہ داری بھی قبول کرتی ہے ہم حکومت کی انتظامیہ سے بھی واشگاف الفاظ میں کہیں گے کہ یہ معاملہ محض بھٹو کی ذات کا نہیں پاکستان کی سالمیت اور کشمیریوں کی آزادی کا معاملہ ہے اس لئے اس موقعہ پر کوئی ایسا حربہ استعمال کرنا جس سے معاملہ قطعی نتیجے کے بغیر طول پکڑے پاکستان کے لئے مضر ہوگا۔ اس لئے حکومت فی الفور تردید کرے تحقیقات کا ڈھونگ رچانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شملہ معاہدے کا ریکارڈ وزارت خارجہ کے پاس ہے۔

بلکہ ہم تو پاکستان کے وقار کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مطالبہ بھی کریں گے کہ جنرل ضیا اس وقت تک بھارت کے دورے کے بائیکاٹ کا اعلان کریں جب تک بھارتی وزیر خارجہ انہیں اس مبینہ خفیہ معاہدے کی نقل نہ بھیج دیں یا پھر ہماری حکومت بھارتی وزیر خارجہ کی پاکستان پر الزام تراشی کے خلاف فوراً بھارتی حکومت کو خود مراسلہ بھیجے کیونکہ بھارتی وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی اعلانیہ طور پر پاکستان کے صحافیوں کے سامنے اس نام نہاد خفیہ معاہدے کی تردید کر چکے ہیں۔ یعنی بھارت کی حکومت تردید کر چکی ہے اس لئے واجپائی کے خلاف پاکستان کا مراسلہ ناجائز مداخلت قرار نہیں پائے گا۔

گرفتار شدہ اخباری کارکنوں کی بقیہ فہرست

۶۳ - لیاقت علی امن کراچی
۶۴ - شبیر خان سن کراچی
۶۵ - محمود ایاز امروز ملتان
۶۶ - خالد جاوید مشرق لاہور
۶۷ - استاد مختار حسین صدر خوشنویس یونین ملتان
۶۸ - دوست محمد - پاکستان ٹائمز راولپنڈی
۶۹ - محمد حسن مرید ہلال پاکستان کراچی -
۷۰ - شوکت حسین مساوات لاہور
۷۱ - غلام محمد - سابق صدر مساوات ورکرز یونین لاہور
۷۲ - صلاح الدین بٹ سیکرٹری مساوات ورکرز یونین لاہور

(صحافیوں کی گرفتاری کے وقت ۴ طالب علم اور مزدور کارکن بھی گرفتار ہوئے)

۷۶ - جمیل اشرف ملک مساوات کراچی -
۷۷ - محمد یعقوب آزاد لاہور
۷۸ - واحد باغی حیات لاہور
۷۹ - حبیب الرحمان مساوات لاہور
۸۰ - آفتاب احمد ملک پاکستان ٹائمز راولپنڈی -
۸۱ - ریاض احمد بھٹی مساوات لاہور
۸۲ - محمد فہیم مساوات کراچی -
۸۳ - محمد عثمان آزاد لاہور

صحافیوں کی حمایت میں ۱۴ مئی کو چار خواتین نے بھی خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا جن کے نام درج ذیل ہیں

۸۴ - مسز الزنجہ خالد
۸۵ - دردانہ یاسمین شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی -
۸۶ روزی مجید 〃 〃 〃 〃
۸۷ - انور سلطانہ صداقت لاہور -
۸۸ - ناصر ملک سن لاہور -
۸۹ - عزیز اللہ خان مساوات کراچی
۹۰ - ارشاد احمد مساوات لاہور
۹۱ - منیر حسین سن لاہور -
۹۲ - عاشق علی شیرازی آفتاب حیدرآباد
۹۳ - ڈائر ڈینو 〃 〃
۹۴ - رحمت علی رازی آزاد لاہور
۹۵ - عبادت شاہ مساوات لاہور

۱۶ مئی ہی کی صبح کو ایپنک پی ایف یو جے کی مجلس عمل کے چھ ارکان کی گرفتاری عمل میں آئی -

۹۶ - ریاض ملک صدر پنجاب یونین آف جرنلسٹس -
۹۷ - آصف علی شاہ صدر پی پی ایل ورکرز یونین
۹۸ - آئی اے راشد سابق صدر پی یو جے
۹۹ - ہمراز احسن نائب صدر پی یو جے
۱۰۰ - علی اختر مرزا سابق صدر پی پی ایل ورکرز یونین
۱۰۱ - بدر اسلام بٹ - سابق سیکرٹری پی پی ایل -
۱۰۲ - ظفر قریشی - رپورٹر - حریت کراچی
۱۰۳ - رؤف بھٹی - نمائندہ مساوات مکران
۱۰۴ - محمد یوسف سومرو - آفتاب حیدرآباد
۱۰۵ فتح محمد بھٹی - ہفت روزہ ہدایت حیدرآباد

(ان کے علاوہ پانچ دیگر افراد گرفتار کیا گیا جن میں ممتاز دانشور لحت بادشاہ، پنجاب مل ورکرز فیڈریشن کے صدر محمد سلیم شیخ بھی شامل ہیں)

مجاہدینِ صحافت

جنہیں کوڑے لگائے گئے

۱ - مسعود اللہ خاں پاکستان ٹائمز راولپنڈی -
۲ - ناصر زیدی نوائے ملتان .
۳ - اقبال جعفری سن کراچی
۴ - خاور نعیم ہاشمی مساوات لاہور

تحریکِ آزادی صحافت کے یہ وہ مجاہدین ہیں جنہیں ۱۳ مئی کو سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے قید بامشقت نقد جرمانے، جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید چھ ماہ کی قید کاٹنے اور پانچ پانچ کوڑوں کی سزا سنائی اور یہ سزا سنانے کے ۲۰ منٹ بعد ہی کوٹ لکھپت جیل میں ان صحافیوں کے کوڑے بھی لگا دیئے گئے

۱۳ مئی آزادی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا جب کہ پاکستان ہی کی نہیں دنیا کی تاریخ میں اہلِ قلم کی ننگی پیٹھوں پر کوڑے لگائے گئے۔

۱۴۲ صحافیوں کو اس سے قبل ایک سال سے تین ماہ قید با مشقت اور جرمانوں کی سزا سنائی جا چکی ہے)

۳۱ - اعجاز محمود مساوات لاہور۔ چھ ماہ قید با مشقت ایک ہزار روپے جرمانہ

۳۲ - محمد ارشد مساوات لاہور چھ ماہ قید با مشقت ایک ہزار روپے جرمانہ۔

۳۳ - محمد اشرف مساوات لاہور۔ چھ ماہ قید با مشقت ایک ہزار روپے جرمانہ

۳۴ - اچھی میمن سیکرٹری لاڑکانہ انجمن صحافیان چھ ماہ قید با مشقت ایک ہزار روپے جرمانہ

۳۵ - محمد الیاس پاکستان ٹائمز نو ماہ قید با مشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۳۶ - عبد الحمید چھاپرا جنگ کراچی۔ چھ ماہ قید با مشقت دو ہزار روپے جرمانہ

۳۷ - خواجہ نثار جنگ کراچی چھ ماہ قید با مشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۳۸ - سید محمد صوفی مساوات کراچی چھ ماہ قید با مشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۳۹ - فتح محمد ڈان کراچی - چھ ماہ قید با مشقت

۴۰ - رانا نذیر اقبال مساوات لاہور۔ تین ماہ قید با مشقت

۴۱ - محمد اشرف علی صداقت کراچی تین ماہ قید با مشقت

۴۲ - محمد خان سن کراچی۔ چھ ماہ قید با مشقت تین ہزار روپے جرمانہ

تمام اہلِ قلم کو بہت مبارک ہو

تمام اہلِ قلم کو
تمام اہلِ وفا کو
تمام اہلِ جنوں کو
تمام اہلِ وطن کو بہت مبارک ہو
رہِ وطن میں انہیں بھی یہ مرتبہ تو ملا
کہ ان کے جسم بھی کوڑوں سے فیضیاب ہوئے
تمام اہلِ قلم کو بہت مبارک ہو
کہ رسمِ عشق ادھوری تھی، ہو گئی پوری
ستم گروں کی عنایت ہے
ظالموں کا کرم
کہ سرخرو تو ہوئے امتحاں میں اہلِ قلم
ابھی تو جسم بہت ہیں، بہت ہے جرأت بھی
ستمگروں کو مگر وقت دے گا مہلت بھی

(محمود شام)

۴۳ - سلیم شاہد امروز ملتان چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ -

۴۴ - سلیم عاصمی - پاکستان ٹائمز راولپنڈی نو ماہ قید بامشقت ایک ہزار روپے جرمانہ -

۴۵ - عزیز صدیقی صدر پاکستان ٹائمز راولپنڈی چھ ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ -

۴۶ - سید شوکت حسین مساوات لاہور نو ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ -

۴۷ - محمد حسین مرید ہلالِ پاکستان کراچی - نو ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ

۴۸ - مختار حسین - امروز ملتان نو ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ -

۵۰ - صلاح الدین مساوات لاہور - چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۵۰ - صلاح الدین مساوات لاہور - چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۵۱ - غلام حیدر مساوات لاہور چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۵۲ - محمد ایوب - آزاد لاہور چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۵۳ - حبیب الرحمان مساوات کراچی چھ ماہ قید بامشقت تین ہزار روپے جرمانہ

۵۴ - جمیل ملک مساوات کراچی - نو ماہ قید بامشقت پانچ ہزار روپے جرمانہ -
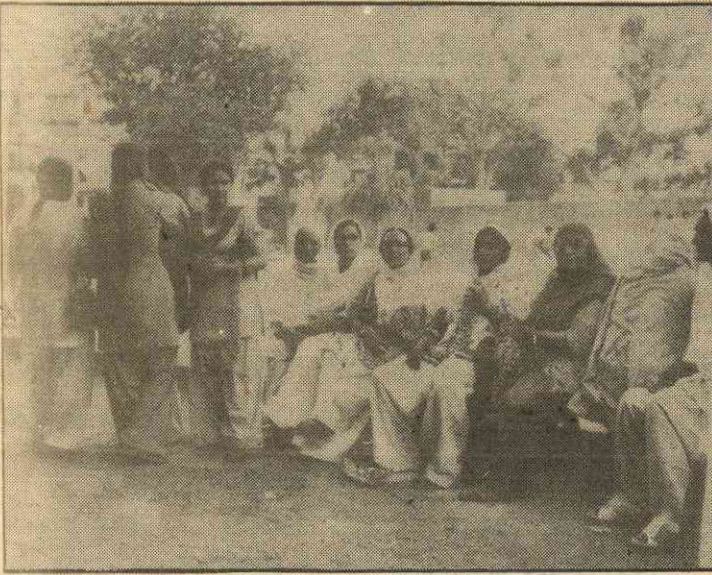
قید اور کوڑوں کی سزاؤں پر عوامی ردّ عمل

ایئر مارشل اصغر خان

تحریک استقلال کے سربراہ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے اخبارات اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ حکومت کو یہ پابندیاں برقرار رکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں وہ وہی لوگ ہیں جو ہمیشہ عوام کی آواز دبانے کی کوشش کرتے رہے ہیں انہوں نے کہا کہ آزادیٔ صحافت اور بحالیٔ جمہوریت کے بغیر ملک کے مسائل میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا اور اگر حکومت نے یہ پالیسی برقرار رکھی تو حالات بہتر ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اصغر خان نے مطالبہ کیا کہ اخبارات پر سے پابندیاں اٹھائی جائیں۔ صحافیوں اور اخباری صنعت کے کارکنوں کو رہا کیا جائے کوڑوں کی سزا کے بارے میں اصغر خان نے کہا کہ کوڑوں کی سزائیں دینے سے اُسی وقت مؤثر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جب یہ سزائیں اخلاقی جرائم میں دی جائیں۔

محمود علی قصوری

تحریک استقلال کے رہنما اور سابق وزیر قانون میاں محمود علی قصوری نے مطالبہ کیا کہ مساوات، معیار، الفتح اور دیگر جرائد پر پابندیاں ختم کی جائیں کیونکہ اخبارات پر پابندی رائے عامہ اور عوام پر پابندی کے مترادف ہے۔ گو مجھے ان اخبارات و جرائد کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں ہے لیکن آزادیٔ اظہار کا حق ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ اور پاکستان کے ہر شہری کو اس اظہار رائے کا حق ملنا چاہیئے۔ میاں محمود علی قصوری نے صحافیوں کو سزائیں دیئے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ عبوری حکومت نے اخباروں اور صحافیوں کے خلاف کالے قوانین کے تحت کارروائی افسر شاہی کے ایماء پر کی ہے ایسی کارروائیاں ایوب اور یحییٰ کے دور میں بھی کی گئی تھیں اگر موجودہ حکومت نے یہ کارروائیاں ترک نہ کیں تو اس کا حشر بھی سابقہ حکومتوں جیسا ہو گا۔

غلام مصطفٰے جتوئی

پیپلز پارٹی سندھ کے قائم مقام صدر غلام مصطفٰی جتوئی نے کہا کہ صحافیوں کو کوڑوں اور قید کی سزا دینا ایک ایسا عمل ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ عبوری حکومت کے اس اقدام سے پاکستان کے وقار اور عزت پر سخت ضرب لگی ہے۔ غلام مصطفٰے جتوئی نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ صحافت جیسے معزز پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد کو کوڑوں جیسی انتہائی سخت سزا دی گئی۔ حکومت سے مذاکرات کے ذریعہ صحافیوں کے مسائل حل کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے جتوئی صاحب نے کہا کہ پاکستان میں ایک وقت میں

اتنے اخبارات و رسائل پر پابندی اور صحافیوں کی گرفتاری کی مثال نہیں ملتی۔ اس قسم کے مسائل کوڑوں کی سزاؤں اور گرفتاریوں سے کبھی حل نہیں ہوا کرتے بلکہ دانش، فہم اور ادراک کے ذریعہ حل کئے جاتے ہیں۔

مولانا عبدالستار خان نیازی

جمعیت علمائے پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خان نیازی نے کہا ہے کہ کوڑوں کی سزا صرف اخلاقی مجرموں کو دینی چاہئے۔ اور صحافیوں، دانشوروں ادیبوں کو اس سزا سے 'مستثنیٰ' ہونا چاہئے کیونکہ صحافی اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں۔

اکبر بگٹی

سابق گورنر بلوچستان اور تحریک استقلال کے رہنما نواب اکبر بگٹی نے صحافیوں کو کوڑوں کی سزائیں دی جانے کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ انتہائی اقدام نا انصافی اور غیر مناسب ہے۔ اکبر بگٹی نے مطالبہ کیا کہ اخباری کارکنوں کو فی الفور رہا کیا جائے اور ان کے مطالبات پورے کئے جائیں۔

مولانا احتشام الحق تھانوی

ممتاز عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی نے کہا کہ مارشل لاء کے قیام کے بعد جب کوڑوں کی سزا کو اسلامی سزا کا نام دیا گیا تو اس وقت بھی ہم نے حکام کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ ریگولیشن کی خلاف ورزی پر سیاسی کارکنوں، طلبہ، مزدوروں اور صحافیوں وکیلوں اور علماء کو کوڑوں کی سزا دینا اسلامی تقاضوں کے منافی ہے۔ مگر یہ بات انتہائی افسوس سے مجھے کہنی پڑ رہی ہے کہ کوڑوں کی یہ سزا اہل قلم، دانشوروں اور صحافیوں کو بھی دی جا رہی ہے جس سے اندرون ملک ہیجان اور بیرون ملک نفرت کا طوفان برپا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ موجودہ عبوری حکومت کا وہ راسپوٹین کون ہے جو ملک اور اسلام دونوں کے لئے رسوا کن مشوروں سے حکومت کو گمراہ کر رہا ہے فوجی حکومت کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ مارشل لاء کا دور عارضی ہے اور اس قسم کے اقدام سے اسے کس حد تک نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مولانا احتشام الحق نے مطالبہ کیا کہ حکومت صحافیوں کو رہا کرے اور اُن کے مسائل حل کرے۔

نفیس صدیقی

نیشنل کونسل آف سول لبرٹیز کے سیکرٹری نفیس صدیقی نے صحافیوں کو کوڑے لگائے جانے کی سزا پر گہرے رنج و تاسف کا اظہار کیا اور قومی اتحاد کے رہنما مفتی محمود کے حالیہ بیان پر جس میں صحافیوں کی جدوجہد کو بھٹو ازم کا نام دیا گیا ہے کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ قومی اتحاد آزادئ صحافت کی حمایت سے دستبردار ہو گیا ہے ملک کے مختلف اخبارات وجرائد کی اشاعت کی بحالی اور گرفتار اخباری کارکنوں کی رہائی کے لئے جدوجہد کرنے والے کارکنوں کو سزائیں خصوصاً کوڑے لگائے جانے سے حکومت مصالحت کے تمام راستے بند کر رہی ہے۔ جس سے حالات بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب ہو جائیں گے۔ نفیس صدیقی نے کہا کہ صحافیوں کی موجودہ جدوجہد کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اخبارات وجرائد کے خلاف خصوصی قوانین کا استعمال بند کیا جائے۔

جسٹس شوکت علی

پاکستان مسلم لبرل پارٹی کے صدر (ریٹائرڈ) جسٹس شوکت علی نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو ایک خط میں لکھا ہے کہ صحافت جیسے انتہائی معزز پیشے سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کو کوڑوں جیسی انتہائی سزا کا مستحق ٹھہرانا مناسب نہیں اور اس سے حکام کی نیک نامی نہیں ہو سکتی۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ آزادئ صحافت کے لئے چلنے والی تحریک کے قائدین سے مذاکرات کر کے اس مسئلے کو پُرامن طور پر حل کرے۔

حنیف رامے

پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ حنیف رامے نے کہا کہ صرف مذاکرات اور بات چیت سے مساوات کا مسئلہ طے ہو سکتا ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نام ایک تار میں محمد حنیف رامے نے کہا کہ صحافیوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا جا رہا ہے اُس سے صورتِ حال خراب ہو سکتی ہے۔ صحافیوں کو انتہائی نوعیت کی سزائیں دینے سے دوسرے طبقے وکلاء مزدور اور طلبہ بھی بھڑک جائیں گے۔ انہوں نے جنرل ضیاء کو یاد دلایا کہ وہ آزادئ صحافت کے وعدے کو نبھائیں۔

ملک قاسم

پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل ملک قاسم نے صحافیوں کو کوڑوں کی سزائیں دینے پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ صحافی اخلاقی مجرم نہیں ہیں انہیں کوڑے نہ لگائے جائیں۔ ملک قاسم نے مطالبہ کیا کہ صحافیوں کے مسائل بات چیت کے ذریعے حل کئے جائیں اور ان کو دی جانے والی سزاؤں پر نظر ثانی کی جائے۔

فاروق لغاری

پیپلز پارٹی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن فاروق لغاری نے صحافیوں کو کوڑوں کی سزائیں دیئے جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اخباری کارکنوں کو دی جانے والی سزاؤں کو منسوخ کر کے ان کے تمام مطالبات فی الفور تسلیم کرے

زین العابدین

پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی سندھ کے صدر زین العابدین نے صحافیوں کو کوڑے مارے جانے پر حکومت کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اخباری صنعت کے کارکن اپنا حق مانگ رہے ہیں اور اُن کی یہ جدوجہد آزادئ صحافت کی تحریک ہے جس کی ہم مکمل حمایت کرتے ہیں۔ زین العابدین نے اُن بیانات کی مذمت کی جو صحافیوں کی تحریک کو پیپلز پارٹی کی تحریک قرار دیتے ہیں۔

وکلاء کا احتجاج

فتحیاب علی خاں۔ اقبال حیدر۔ ایس اے ودود علی امجد۔ اقبال حیدر۔ زین العابدین خاں لودھی عبدالمجیب پیرزادہ۔ صدیق کھرل۔ اختر حسین۔ صبیح الدین۔ جی ایم قریشی۔ نورالدین سرقی۔ رشید اخوند شہنشاہ حسین۔ حسین شاہ راشدی۔ رشید رضوی سمیت کراچی کے ۳۴ وکلاء نے ایک مشترکہ بیان میں صحافیوں کو کوڑے مارے جانے کی سزا پر گہری تشویش کا اظہار

باقی صفحہ ۷۰ پر

To make good, to prove, to confirm, to pronounce to be good commmand -- to give approval, oh Lord, to what I have done. says Webster" To sanction officially, to ratify, confirm, accept as satisfactory, to have or express a favourable opinion." Soules dictionary of English Synonyms says, "Commend, recommend, praise, appreciate, think well or favourably of, think highly of, speak well of, be pleased with. Sanction, confirm, justify, ratify, uphold, concur in." This should prove beyond doubt that when I say that "I had the approval of the President when I wrote it" it means the President had no foreknowledge, he only approved of what I had said. The practice is to use the words "prior approval" where it is meant to convey the meanings Mr. Suleri has tried to give to my words in the letter. May I expect Suleri Sahib to now apologise to me for having accused me of perjury and taking a false oath?

Let me finally add in my personal context that I did not suggest a confederation I merely said " I would then commend for consideration --- the possibility of establishing an RCD, Commonwealth or even confederation. As for the definition of a confederation I have relied on the authority of a recognised text book. Mr. Suleri's interpretation can only be acceptable when he too is accepted as an authority on the science of politics.

Now for some of the arguments Mr. Suleri has put forward in support of his contention that a secret deal did take place. One of the misfortunes of my friends like Mr. Suleri is that they think and act only in grooves (may be of national thinking). When one insists on going through grooves one falls in the same pitfalls over and over again. It needs courageous men to "move away from the general accepted grooves." It takes great nationalists to change national thinking. Moving in grooves landed us in the abyss of 1971 and if we insist in moving through thesame grooves we are heading for the same abyss once again. For lack of space and time I would only point out the flaws in some of Mr. Suleri's arguments. He says that failed talks in two hours were transformed into an agreement. He smells something fishy. He thinks a secret deal was struck. The SALT talks between Russia and America have been stalemated for years. If one fine m-rning an agreement is signed, by Mr. Suleri's logic, it will be the result of a secret deal between Brezhnev and Carter. Nearer home, the talks on the formation of a national Government are defying the efforts of the CMLA and political parties. If as a result of one more two hour meeting, the accord comes about, would it be correct to assume, even assert, that the National Government is the result of a secret deal between the General and the Mufti? Mr. Suleri suggests that Mujib shouldnot have been released by Mr. Bhutto and that he should have been used as a "trump card" and his release should have been used as a barter for the release of our POWs. That one man should have been equated with 90,000 would have been the grossest of insults to our valiant soldiers, already disgraced by the ineptness of their generals and the corruption of their rulers. Our pride or what remained of it would have been injured beyond hope of recouping. Again, if Mr. Suleri's arguments with regard to Kashmir are accepted in toto where would Pakistan's stand vis-a-vis Jungadh, Manavader and Hyderabad land us? It would paint us in the darkest of hues. Further if "legitimacy which only a mother country could [illegible] a breakaway part" were the only criterion for the existence and recognition of a State, his off repeated contention that India has not accepted the fact of Pakistan would fall to pieces. The will of a people is the only legitimising factor for the existence and recognition of a nation.

Lastly, much reliance is being placed in support of the theory of "a secret deal' on the acts of creating a line of control and the attempt to make Azad Kashmir a province of Pakistan. To my mind, theoretically speaking, there is nothing incongruous or anamolus in these acts. The cease-fire line was the internationally defind (under U.N. aegis and patrolling) demarcation. The bilateral agreement only demarcated a mutually agreed line which had to be given a new name vis Control Line. Both lines coexist and are virtually parallel at some places and as one at others. If the Cease-fire line were to be oblierated by the agreement or secret deal Mrs. Indira Gandhi should have asked for the withdrawal of U.N. Forces.

The sinister move now made by Desai-Vajpayee is not without mischief and ulterior motives. We must not forget the circumstances in which Pakistan negotiated with India. It was 1972, not 1978. Secondly, if Pakistan's contention and determination that Kashmir has one day to become part of Pakistan is true and firm, then we have nothing to give to India. We have to get what is our right - - occupied Kashmir. Therefore what we have - - Azad Kashmir is ours by rights and by leg lity. Therefore if we make it part of the land and remove its uncertainty what harm can be done. It may be argued that India may do the same with occupied Kashmir. True, but that would neither be right nor legal. The cent per cent Muslims of Azad Kashmir have made their choice. The majority in occupied Kashmir shall one day make theirs.

This brings one to my suggested solution of the imbroglio of Kashmir. We have already fought, in vain, three wars. Let us face the fact that might shall not establish the right. In international affairs as in invidual human affairs disputes are finally and only decided by a spirit and act of give and take. The independence of the valley and the amalgamation of Azad Kashmir and Jammu by Pakistan and India respectively shall in the last analysis be the only practical course. But this is my view and I have the right to my views as others have to hold on to theirs.

Let me, lastly, make my oft repeated plea. Let us not accuse and condemn each other. Kashmir is a matter of life and death for what remains of Pakistan. Let us hear each other out and try to arrive at a consensus. We are once again at the threshold another round of talks in a bilateral attempt to solve our one and only, yet most vital, dispute with India. On its solution hangs thefuture of both countries. Depending on the goodwill of Mr. Desai takes us nowhere. Our own determination to find a just and practical solution will ensure peace and prosperity for us.

شیخ حامد محمود - ان صحافیوں میں شامل تھے - جو صدر بھٹو کے ساتھ جون ۱۹۷۱ء میں شملہ گئے تھے - دائیں بازو کے مشہور صحافی زیڈ اے سلہری نے پاکستان ٹائمز میں ایک مضمون میں شیخ حامد محمود کے ایک مضمون پر تبصرہ کیا تھا - شیخ صاحب نے اس کے جواب میں پاکستان ٹائمز کو جو مضمون بھیجا - وہ پریس ٹرسٹ کی صحافتی اخلاقیات کے عین مطابق شائع نہیں کیا گیا - اور واپس بھیج دیا گیا - شیخ صاحب کا یہ مضمون - قارئین مسئلہ کی نذر ہے - (ادارہ)

شملہ معاہدہ میں کشمیر پر خفیہ سودے بازی

شیخ حامد محمود

KASHMIR

THE SECRET DEAL DEBATE BY HAMID MAHMOOD

The Additional Secretary, Ministry of Information, Government of Pakistan, Mr. Z.A. Suleri has, in his first published piece, since assuming office, disclosed that a deal, presumably secret, on Kashmir had taken place at Simla between Bhutto and Indira Gandhi apart from the agreement called the Simla agreement. Secretaries to the Government, even additional ones, are authoritative official spokesmen. In fact, the 'Secretaries' are the Government. They always, as long as they are in Government service, speak on behalf of the Government. They usually do not speak unless spoken to nor utter anything unless asked to do so. It would, therefore, be safe to presume that the additional secretary, and that too of the Ministry of Information, has been asked to divulge, on behalf of the Government, the information that there was " A secret deal on Kashmir". It would, as a logical consequence be safe, again to presume that an offic-ial Press note confirming the disclosure will be issued in a few days. This presumption is supported by Mr. Suleri's declaration. He says, The secret understanding ... which must have been reduced to writing and surely see the light of day one of these days. "Notwithstanding the fact that whatever is reduced to writing cannot be secret once it is written down and recorded, it is time that the Ministry of Foreign Affairs or Mr. Agha Shahi, a member of the Pakistan delega-tion to Simla and present Adviser to the CMLA on foreign affairs, were to "show the light of the day to the reduced to writing" deal on Kashmir. I cannot cross swords with Suleri Sahib on the question whether there was a secret deal or not. Although I was present at Simla, I was not present at the parleys nor was I privy to the secret pow wow between Bhutto and Indira. While I have no information, Mr. Suleri not only now has information, he has the whole Ministry of Information behind him. Nevertheless I am exercising through the courtesy of the Editor of the Pakistan Times, my right to defend myself against the broadside fired by Mr. Suleri from his recently acquired "machan" in the Ministry of Information supplied by "ammunition" in the form of letters and documents by the same Ministry, perhaps the Foreign Affairs Ministry also, and to answer some of the arguments he has put forward in support of his contention. First, I would like to say that it does not behove a good Muslim, bordering on being a Momin, that Suleri Sahib is, to disbelieve his fellow Muslims (one of them making a statement on oath) and to rely on the words of an infidel. It is strange that Mr. Aziz Ahmed, Mr. Agha Shahi and a host of others Muslims including a sinn-ing Muslim like myself deny something and are yet deemed liars while Mr. Atal Bihari Vajpayee, leader of the Rashtriya Sewak Sangh and India's Foreign Minister, is accepted as a purveyor of gosepel truth, forgetting conveniently that Mr. Vajpayee agitated against the Simla agreement in 1972 as a treaty which was tantamount to a surrender on the negotiating table by Indira Gandhi. But perhaps truth dawned on him one year after he assumed office at the Indian Foreign Ministry and one month before General Zia-ul-Haq is due in Delhi, while it became known to Mr. Suleri as soon as he assumed charge of the additional secretaryship in the Government of Pakistan. It is significant that one of the signatories of the Simla Agree-ment - - Mrs. Indira Gandhi -- has denied that any secret agreement took place. As for the other signatory, Mr. Suleri, please be chivalrous and judicious. Do not act like the court of the Star Chamber. Do not judge a person before hearing him. Do not condemn and pronounce judgement against him first and then proceed to tailor, correlate and collate the evidence in support of your prior judgement. You have the accused chained and gagged. It is unfair to decide against him while he is incommunicado. As the expert in the Ministry of Information it would be honourable if Mr. Suleri were to advise the CMLA to follow the example of another CMLA who has allowed a condemned prisoner to state his point of view on national TV. I am referring to Mr. Marocs and Mrs. Acquino of the Phillipines. Kashmir is such a vital question for Pakistan that it is imperative that Mr. Bhutto be given an opportunity to clarify his position before final judgement is passed on him. I am presuming, it being so obvious, that Mr. Suleri has the approval of the "highest in the land" for what he has written. Only I shall not insult him by giving the word "approve" the meaning he has tried to convey in my case. But first let me confess I did write the letter he has quoted (I however protest at the deliberate incompleteness of the quotation from it). It was not, however, written"on being tackled' but in answer to a mischief, Mr. Suleri's nephew, then Secretary of Information tried to commit. I did use the words "I MAY ADD THE ARTICLE IN QUES-TION WAS APPROVED BY THE PRESIDENT WHEN I WROTE IT."

I have stated that "I am willing to state on oath that Mr. Bhutto had no prior knowledge of this article."The question is whether I have made a deliberate mis-statement and am guilty of falsehood under oath. Mr. Suleri has tried to prove so by quoting the above words from my letter. This is either intellectual dishonesty or ignorance of the mean-ing of the word "Approved." He has tried to convey that "approval" means that Mr. Bhutto had prior knowledge of the article. It seems that Mr. Suleri has buried his dictionery. Compared to him I am a pretty illiterate and uneducated person. I have therefore to rely on standard dictionaries. The Shorter Oxford Dictionary states under the heading "approve"

اظہارِ خیال

راؤ فرمان علی کا نیا مورچہ

مشرقی پاکستان میں افواج کو سرنڈر کرنیوالے اب پاکستانی عوام کو سرنڈر کروانا چاہتے ہیں

پاکستان کی تاریخ کے ایک اور متنازعہ (سابق) جنرل اس وقت موضوع گفتگو بنے ہوئے ہیں۔ ریٹائرڈ جنرل نیازی کو جس طرح ہماری دائیں بازو کی جماعتوں نے "اپنایا" ہے اسی سے ان جماعتوں کے نظریہ پاکستان کی تشریح کرنے میں خاصی آسانی پیدا ہو گئی ہے اور اب جنرل نیازی کے شریک کار سابق جنرل راؤ فرمان علی بھی میدان سیاست میں کود پڑے ہیں۔ میدان سیاست میں انکی یہ جست کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہے بلکہ ان کے حالیہ مضامین اور یادداشتوں کی اشاعت کے بعد اب یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ وہ دورانِ ملازمت بھی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔ اپنے مذکورہ مضامین میں انہوں نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی، نہ صرف یہ کہ ان کے دل میں جماعت اسلامی کے لئے نرم گوشہ موجود رہا ہے بلکہ وہ جماعت اسلامی کے نظریات کے بڑے معتقد واقع ہوئے ہیں۔ سابق جنرل فرمان علی کے سابقہ اور موجود کرداروں میں بس یہ فرق ہے کہ پہلے وہ فوجی ملازم کی حیثیت میں فوج کو سیاست میں ملوث کرنے اور پھر فوج کے ہتھیار ڈلوانے کا کام کرتے تھے اور اب انہوں نے نیا مورچہ کھولا ہے اور اس مرتبہ وہ سیاستدانوں کا چولا بدل کر عوام کی سرنڈر کروانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے فوج کے پاس سرنڈر کرنے کے لئے صرف ہتھیار ہوتے ہیں جو سقوطِ ڈھاکہ کے وقت سرنڈر کر دیئے گئے اور عوام کا اثاثہ انکے حقوق ہوتے ہیں اور اگر رائے کے اظہار کا حق، ووٹ کا حق، اور جمہوریت کے قیام کا حق سرنڈر کرا دیا جائے تو ملک اور قوم کا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یحییٰ خان کے زمانے میں جنرل شیر علی جو کردار ادا کرتے تھے اب شاید وہ کردار فرمان علی کے سپرد ہے۔ جنرل فرمان علی نے اپنی موشگافیوں کے لئے یہی وقت کیوں مناسب سمجھا اس پہ غور کرنا ضروری ہے۔ اس وقت قومی حکومت کا مسئلہ درپیش ہے۔ اور دائیں بازو کی بیشتر جماعتیں اس کے چکر میں پھنس چکی ہیں، مگر مفتی محمود اینڈ گروپ کو ثر نیازی کے قومی حکومت میں شرکت میں تذبذب کا شکار رہے۔ ایسے میں معلوم ہوتا ہے کہ ان بکھرتی ہوئی سیاسی لابیوں کو قریب لانے بلکہ گھیرنے کے لئے فرمان صاحب فرامین جاری کر رہے ہیں۔ لیکن قومی حکومت میں شرکت کی خواہش مند سیاسی جماعتوں کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ جس قوت کو اپنے تئیں وہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں کہیں وہی قوت انہیں استعمال نہ کر بیٹھے۔ تھائی لینڈ کا تجربہ کوئی بہت زیادہ پرانا واقعہ نہیں ہے۔

جنرل فرمان علی صاحب نے ماضی میں جبکہ وہ فوجی ملازمت میں تھے، کیا سیاسی کارنامے سرانجام دیئے اس کا اظہار انہوں نے خود اردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ اپنی یادداشتوں میں کر دیا ہے، عوامی لیگ اور سابق مشرقی پاکستان کی ترقی پسند اور عوام میں مقبول سیاسی جماعتوں کی قوت سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے رجعت پسند اور دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے ساتھ جو عوام دشمن اتحاد بنانے کی کوشش کی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اس مہیب خطرے کے پیش نظر میں نے ذاتی طور پر عوامی لیگ کے مقابلے میں ایک عظیم قوت تیار کرنے کی کوشش کی، اسے ذاتی کوشش اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں یہ سارا عمل تن تنہا سرانجام دیتا رہا۔ انتظامیہ اس میں شریک نہ تھی۔ بعض سیاسی جماعتیں ماسکو نواز تھیں اور بعض پیکنگ نواز تصور کی جاتی تھیں۔ میری ایک ہی تمنا تھی کہ کوئی سیاسی قوت پاکستان نواز بھی ہو اس مقصد کے لئے سیاسی جماعتوں میں طویل مذاکرات ہوئے"

قطع نظر اس کے کہ عوام میں مقبول سیاسی قوت کے خلاف قائم ہونے والی نام نہاد "پاکستان نواز قوت" نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ جنرل صاحب ہمیشہ سے سیاست میں ملوث رہے ہیں۔

سابقہ مشرقی پاکستان میں قائم ہونے والی ڈاکٹر مالک کی غیر منتخب صوبائی حکومت میں انہیں "پاکستان نواز" جماعتوں نے وزارتیں بٹوریں۔ صدر نکسن نے ۱۹۷۰ء میں امریکی کانگریس میں پیش کردہ اپنی خارجہ امور کی رپورٹ میں نشاندہی کی تھی "یحییٰ خان نے ڈاکٹر مالک کی حکومت امریکہ کی خواہش پر قائم کی تھی" اس قومی حکومت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی، چنانچہ عوام نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔

اس نام نہاد قومی حکومت کے وزیر تعلیم جماعت اسلامی کے مولانا عباس علی خان (موصوف نے عوامی لیگ کے منتخب نمائندے کے ۶۱ ہزار ووٹوں کے مقابلے میں صرف ۱۶ ہزار ووٹ حاصل کئے تھے۔) نے اعلان کیا تھا بلکہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ہندوستان رمضان کے مہینے میں مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے تاکہ عید کی نماز کلکتہ میں ادا کر سکیں۔ کوئی جماعت اسلامی سے پوچھے کہ جناب سات آٹھ سال سے آپ کی وہ نماز عید ادا کیوں نہیں ہوئی۔

ایک بار پھر غیر منتخب حکومت کے قیام کا چرچا ہے۔ مگر اس حکومت کے قیام کے ایک داعی —

جنرل فرمان صاحب سیاسی جماعتوں سے کتنے مخلص ہیں اس کا اندازہ اس عبارت سے لگائیں کہتے ہیں

"ان واقعات کا تجزیہ ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتا ہے کہ مارشل لاء اپنے سوا کسی سویلین حکومت کو اقتدار منتقل نہیں کر سکتا۔ آسان اور قابل عمل ایک ہی راستہ ہے کہ مارشل لاء حکومت اپنے کو ایک سویلین حکومت میں تبدیل کر کے عوام کی آئینی تائید حاصل کرے باقی تمام راستے خطرات سے پُر ہیں۔"

جنرل فرمان علی صاحب اور انکے دیگر ہم خیال و ہم مسلک لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ عوام کی قوت ہی اصل قوت ہے خواہ آپ اسے کتنا ہی کمتر کیوں نہ خیال کریں اور پاکستان میں آپ کی جو کاوشیں ۱۹۷۰ء میں کامیاب نہ ہو سکیں وہ ۱۹۷۸ء میں کہاں کامیاب ہوں گی۔ قومی حکومت ضرور قائم کرتے رہیں، سیاستدانوں کو گھیر گھیر کر لائیں اور راس قومی حکومت میں شامل کریں اور ان کٹھ پتلیوں کا تماشا چاہیں مگر واضح رہے کہ جس حکومت کو عوام کی منظوری حاصل نہیں ہوگی اس کو کوئی ریٹائرڈ اور میدان جنگ میں شکست خوردہ افسر اپنے فرمان سے مستحکم نہیں کر سکتا۔ عوام کسی ذاتِ شریف یا نام نہاد قومی حکومت کے سامنے اپنے جمہوری حقوق سرنڈر نہیں کریں گے۔

∞

بھٹو ہی اصل مسئلہ ہے

حکیم شوکت اقبال (فیصل آباد)

بھٹو ہی اصل مسئلہ ہے۔
اگر یہ جھوٹ ہے .... تو

انتخابات نوے دن کے اندر کروانے کا وعدہ جو ایک اسلامی مملکت کے مسلمان سربراہ نے خلوص نیت کے ساتھ صرف پاکستان کے عوام ہی سے نہیں، اقوام عالم سے بھی بلکہ سب سے بڑھ کر خدا سے کیا تھا۔ یقیناً پورا ہو چکا ہوتا۔ اور ہماری افواج پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے اور مشکل ترین بحران کو حل کرنے میں کامیاب ہو کر قوم کی طرف سے بجا طور پر داد و تحسین کی مستحق قرار پاتیں۔ اور دنیا بھر میں ہماری افواج اور خود پاکستان کا وقار اس قدر بلند ہو چکا ہوتا کہ ہر پاکستانی اس پر یقیناً اپنا سر فخر سے بلند کر سکتا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ اور اکتوبر کے انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے گئے جس کی وجہ عبوری حکومت کی طرف سے بغیر کسی لگی لپٹی کے یہ بتایا گیا کہ "اپنڈے سائیٹس" سمجھ کر جس کا آپریشن کیا جا رہا تھا وہ کینسر نکلا اور اس کی وضاحت یوں کی گئی کہ جب تک بھٹو اور پیپلز پارٹی کا محاسبہ مکمل نہیں ہو جاتا انتخابات کروانا بے سود ہو گا۔ اس میں منافقت نہیں بلکہ ایک موقف کی وضاحت تھی اور ایک سچائی کا اعتراف بھی کیونکہ انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرتے وقت جس بھٹو کو "اپنڈے سائیٹس" سمجھا گیا وہ انتخابی آپریشن (مہم) کے دوران کینسر نکلا۔ اور یہی "کینسر" عبوری حکومت کے واحد مشن (انتخابات) کی تکمیل میں رکاوٹ بن گیا۔ اور یوں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے اس موقف کی وضاحت کے سلسلہ میں حکومت کو خاصی دقت اٹھانا پڑی۔ بھٹو ایک سیاسی "کینسر" ہے اس سے کوئی ذی شعور اختلاف نہیں کر سکتا۔ اختلاف کہہ لیجئے یا حُسنِ اتفاق کہ جس کینسر کو فوجی حکومت ملک کے لئے نقصان دہ سمجھتی ہے بین الاقوامی سامراج اُسے ایشیا اور افریقہ میں اپنے مخصوص مفادات کے لئے ایک عظیم خطرہ تصوّر کرتا ہے اس اختلاف یا حُسنِ اتفاق پر فیصلہ کن رائے تو عوام ہی دے سکتے ہیں مگر تشویش ناک بات یہ ہے کہ جمہوریت کے "علمبردار" جو بھٹو کی آمریت کے خلاف سالہاسال سینہ سپر ہونے کے دعویدار ہیں۔ اب خود بھٹو اور پیپلز پارٹی کے معاملہ میں فوجی حکومت سے یکطرفہ اور غیر آئینی طرز عمل اختیار کرنے کی باتیں کر رہے ہیں اور یہ طرز عمل بھٹو کے عوامی سطح پر ناقابل تسخیر ہونے کا ایک ثبوت بھی ہے اور یوں یہ حقیقت "بھٹو اور پیپلز پارٹی کو ملک کے موجودہ سیاسی بحران میں مرکزی حیثیت عطا کرتی ہے۔

کیا بھٹو ایک معمولی مسئلہ ہے؟ معمولی غور و خوض کے بعد بھی ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ کہ خواہ مسئلہ کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ عوام کا مسئلہ ہو۔ تیسری دُنیا کا مسئلہ ہو۔ فوجی حکمرانوں کے لئے مسئلہ ہو یا سامراج کے لئے یہ ایک مسئلہ ضرور ہے اور حالات یہ واضح کرتے کہ یہ ایک معمولی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کیونکہ بھٹو ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ بقول جمہوریت کے ایک "نڈر مجاہد" کے جو بھٹو کی آمریت کا نشانہ بھی رہا بھٹو اب بھٹو ازم بن چکا ہے۔ یعنی۔ ایک سوچ، ایک نظریہ جس کے لوگ حامی بھی ہیں۔ اور مخالف بھی کتنے مخالف ہیں اور کتنے حامی، اصولی طور پر تو یہ فیصلہ جمہوری اصولوں کے مطابق عام انتخابات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے کہ اکثریت کس کے ساتھ ہے۔ لیکن بھٹو کو آمر کہنے والے اس "مرد جمہوریت" کا اصرار ہے کہ پہلے بھٹو ازم کو ختم کیا جائے پھر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کروائے جائیں۔ اور یہی موقف اس کے دوسرے ساتھیوں کا ہے۔ جو جمہوریت کی خاطر اپنی قربانیاں گنواتے نہیں تھکتے

اب بھٹو ایک مسئلہ تو ہوا۔ اور ایسا مسئلہ کہ جس سے نمٹے بغیر ملک میں عام انتخابات نہیں ہو سکتے۔ یعنی عوام کو اپنی نمائندہ حکومت چننے کا حق نہیں مل سکتا۔ اور فوج اپنا واحد مشن (انتخابات) پورا کر کے بیرکوں میں واپس نہیں جا سکتی لہٰذا بھٹو ایک مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک بڑا مشکل مسئلہ ہے جس کو سوچ سمجھ کر نمٹانے کی ضرورت ہے

بھٹو دراصل اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ اس کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے اسلام اور نظامِ مصطفےٰ جیسے مقدّس نعروں کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا گیا اور بھٹو کے اقتدار سے ہٹائے جانے کے دو چار ماہ بعد ہی مخالف جماعتوں کے ایک سرکردہ رہنما نے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی کہ ان کے پاس "نظامِ مصطفےٰ" نام کا کوئی واضح پروگرام موجود نہیں

باقی صفحہ پر

افغانستان میں
عوامی جمہوری
انقلاب
تصاویر کے آئینہ میں

عبدالقادر ڈگروال - وزیر دفاع
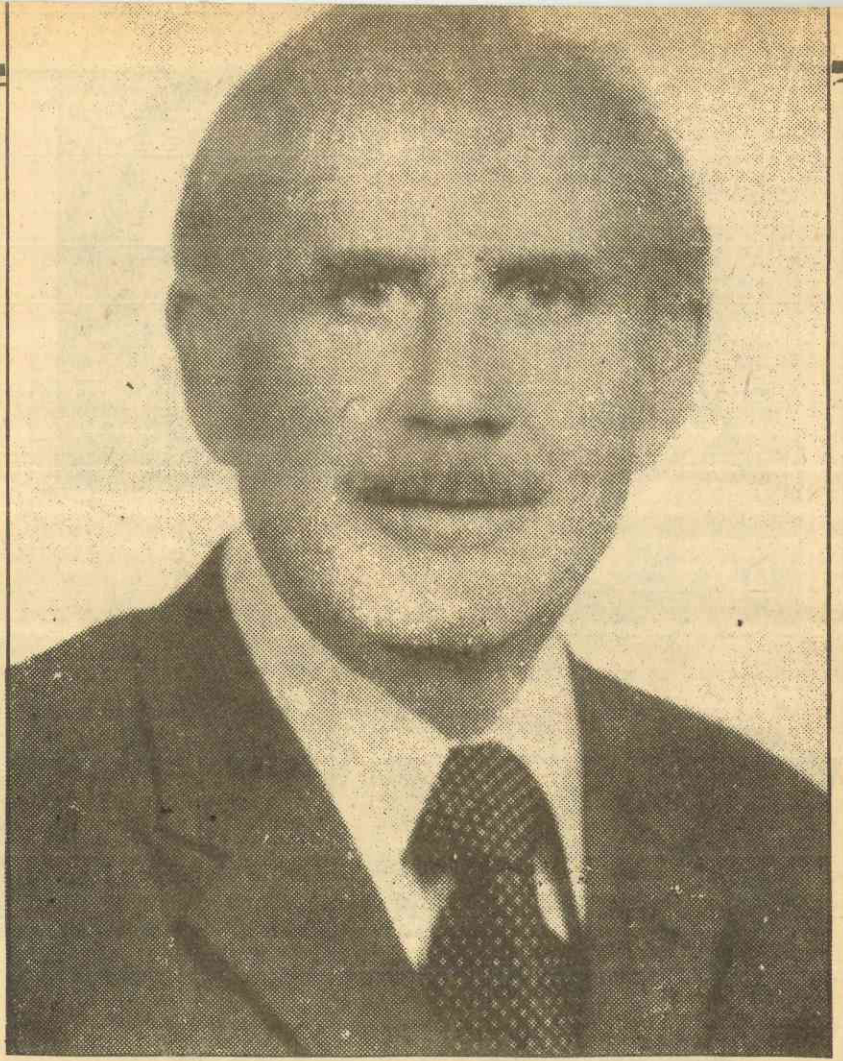
افغانستان میں عوامی جمہوری انقلاب کے قائد صدر اور وزیر اعظم نور احمد ترہ کی

انقلاب کے تیسرے روز کابل کی سڑکوں پر ٹینک گشت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ ولی۔
وزیر صحت عامہ

محمود سوما

بارق شفیعی۔ وزیر اطلاعات

حفیظ اللہ امین۔
صدارتی معاون وزیر امور خارجہ

ڈاکٹر اناصنیا راتبزادہ وزیر سماجی بہبود۔

سلیمان لائق ۔
وزیر ریڈیو و ٹیلی ویژن

محمد اسلم وطن گیر۔ صدارتی معاون وزیر مخابرات

دستگیر سنجشولی۔ وزیر تعلیم و تربیت

عبدالقدوس غوربندی۔ وزیر تجارت

سلطان علی کشتمند وزیر منصوبہ بندی
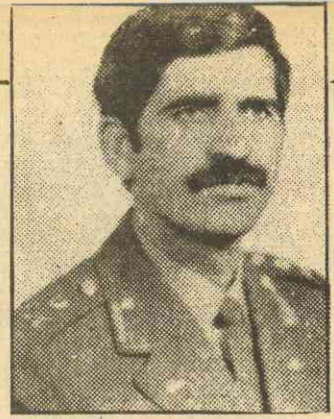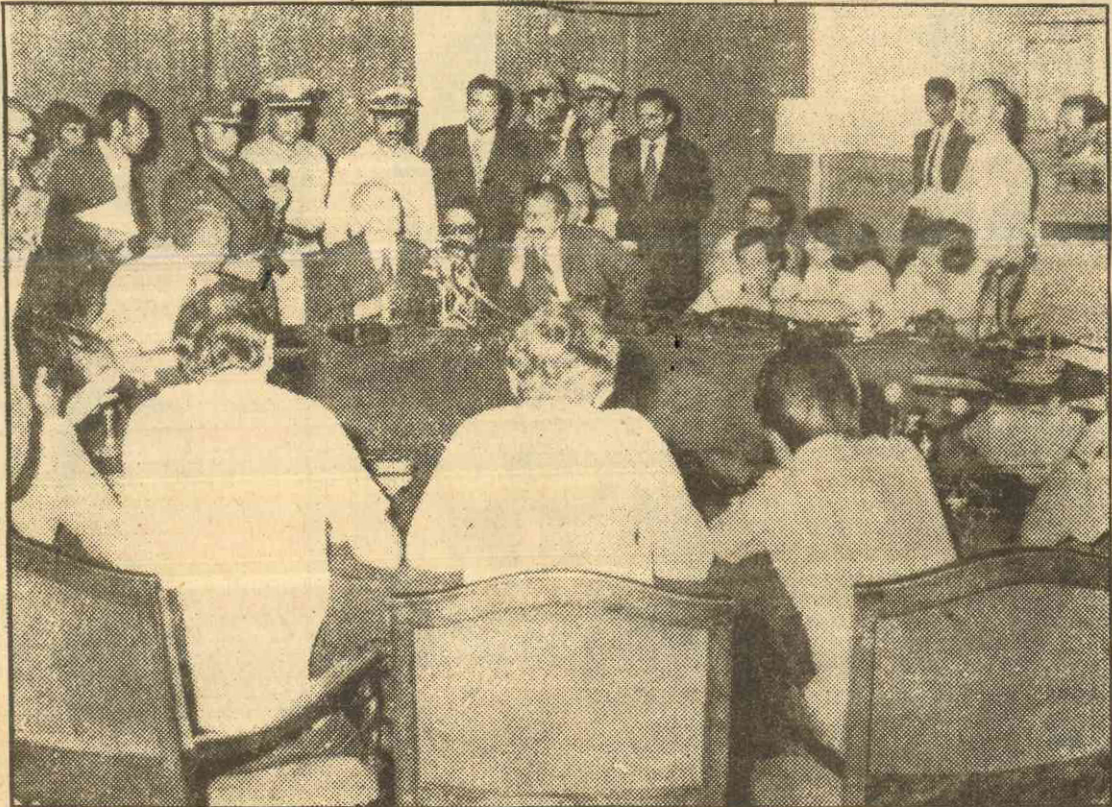
عبدالکریم شرعی جندجانی۔ وزیر عدلیہ

ڈاکٹر صالح محمد زیری۔ وزیر زراعت

انقلاب کے بعد نور احمد ترہ کی کی پہلی پریس کانفرنس

نوراحمد نور وزیر امور داخلہ

انجینئر محمد اسماعیل دانش ۔ وزیر صنعت

عبدالکریم میثاق ۔ وزیر خزانہ

محمد منصور ہاشمی وزیر برقاب

نظام الدین تہذیب

محمد رفیع وزیر عوامی بہبود
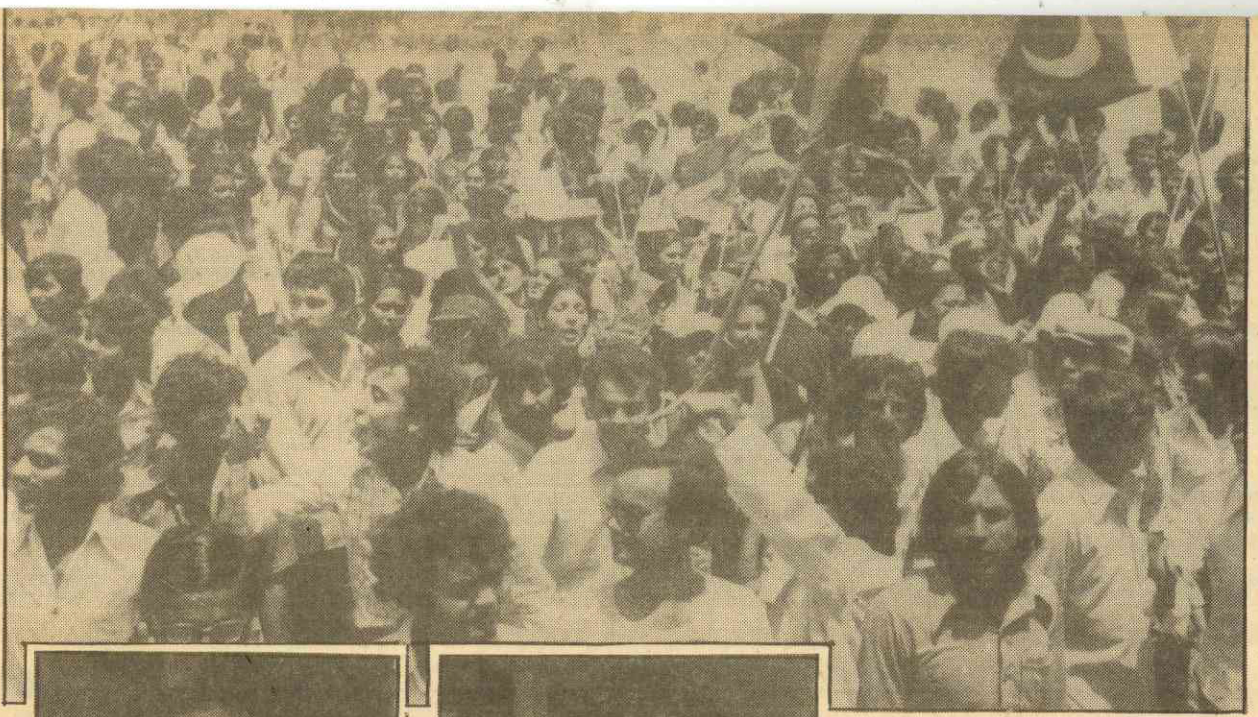
اسلامی جمعیت طلبہ کے مضبوط قلعے میں خطرناک شگاف

جامعہ کراچی کے انتخابات میں طلبہ و طالبات نے اس سال طلبہ تنظیموں کے ساتھ بڑا دلچسپ سلوک کیا اور کچھ اس طرح ووٹ ڈالے کہ جامعہ کی تاریخ میں پہلی بار دونوں پینلوں سے برابر، برابر کے اُمیدوار کامیاب ہوئے مگر انتخابی نتائج اس اعتبار سے لبرل پروگریسو نیشنلسٹ الائنس کے حق میں رہے کہ یونین کی مرکزی اور اہم نشست پر مصطفین کاظمی اسلامی جمعیت طلبہ کے اُمیدوار کو ۳۴ ووٹوں سے شکست دے کر یونین کے صدر منتخب ہوئے۔

جامعہ میں انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوتے ہی جس بھرپور طریقے سے انتخابی مہم کا آغاز ہوا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہ اس سال مقابلہ بڑا سخت ہوگا ایک طرف اسلامی جمعیت طلبہ کی منظم اور لامحدود وسائل رکھنے والی تنظیم تھی جس کے امیدواروں میں کوئی بھی اپنی شخصیت کے اعتبار سے نمایاں نہ تھا۔ ان امیدواروں کو کوئی کریڈٹ حاصل تو تھا تو جمعیت کی تنظیم تھی یا پھر ماضی کی کامیاب فتوحات دوسری طرف روایت کے مطابق اسلامی جمعیت طلبا کی مخالف طلبہ تنظیمیں لبرل پروگریسو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس ایک مشکل مرحلے سے گذر کر اتحاد کے مرحلے میں اس وقت داخل ہوئیں جب انتخابی مہم کے لئے صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔ پھر یہ مشترکہ اتحاد جامعہ کے عام طلبہ میں خصوصاً طالبات کی اکثریت کی حمایت کے باوجود اپنے جلسے جلوسوں اور خاص طور پر انتخاب کے دن طلبہ و طالبات کو لانے اور اُن کی فیسیں ادا کرنے کا اہم ترین کام بھی اس طرح منظم نہ کر سکا جیسے اسلامی جمعیت طلبہ اپنے سیاسی پروگرام کی عام طلبہ میں عدم مقبولیت کے باوجود اپنی منظم تنظیم اور بے پناہ وسائل کو استعمال میں لا کر کر گئی۔ جامعہ کے باخبر حلقے

ترقی پسندوں کے اتحاد کی بدولت شاندار جزوی فتح

بتاتے ہیں کہ صرف انتخابات کے دن اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں نے ڈیڑھ سو طلبہ کی نیسیں ادا کیں اور یہی وہ فیصلہ کن ووٹ تھے جن کے سبب لبرل پروگریسو فرنٹ اور نیشنلسٹ الائنس کے تمام امیدوار کامیاب نہ ہو سکے تاہم گذشتہ سال کے مقابلے میں جب کہ اسلامی جمعیت طلبہ کا پورا پینل کامیاب ہوا تھا اس سال جامعہ میں جمعیت کے قلعے میں شگاف پڑ گیا ہے۔ اور جس تیزی سے جامعہ میں جمعیت طلبہ کے قدم اکھڑ رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ سال ترقی پسند اور لبرل اس سے بڑی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوں گے۔

جامعہ میں جیتنے والے اور ہارنے والوں کے ووٹوں کا تناسب یہ رہا۔ الائنس کے مشترکہ امیدوار مصطفین کاظمی نے دو ہزار ۱۹۰ ووٹ حاصل کئے اور اسلامی جمعیت طلبہ کے سلیم مغل نے دو ہزار ۱۴۷ اس طرح مصطفین کاظمی ۴۳ ووٹ سے کامیاب ہوئے۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے عارف صدیقی دو ہزار ایک سو ووٹ لے کر کامیاب ہوتے ان کے مقابلے میں الائنس کے مظفر معراج نے دو ہزار بانوے ووٹ حاصل کئے اور صرف آٹھ ووٹوں سے ہارے ابھی اس عہدے پر دوبارہ گنتی ہونی چاہیئے۔ الائنس کے جوائنٹ سیکریٹری محمد طیب نے دو ہزار ایک سو ۳۳ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی اُن کے مقابلے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے محمد سلیم نے دو ہزار ایک سو ۲۴ ووٹ حاصل کئے گرلز جوائنٹ سیکریٹری اسلامی جمعیت طلبہ کی عالیہ ظفر احمد منتخب ہوئیں۔ انہوں نے دو ہزار ۱۵۴ ووٹ حاصل کئے۔ اُن کے مقابلے میں الائنس کی روبینہ ضیا کو دو ہزار ایک سو ۴۲ ووٹ ملے اس نشست پر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی گوہر نقوی بھی کھڑی ہوئی تھیں اور انھوں نے ۱۸ ووٹ حاصل کئے تھے روبینہ ضیا کی ناکامی کا ایک سبب این ایس ایف کے یہ ۱۸ ووٹ بھی بتائے جاتے ہیں۔ این ایس ایف اگر اپنی انفرادی مہم جوئی کا مظاہرہ نہ کرتی۔ تو ترقی پسند یہ نشست بھی حاصل کر لیتے۔

انتخابی نتائج سے قطع نظر اس مرتبہ جامعہ میں وہ روایتی جلوس تو نہ نکل سکا جو رات بھر شہر بھر میں فتح

باقی صفحہ ۷ پر

بقیہ جات

بقیہ، جامعہ کراچی

کا جشن منایا کرتا تھا۔ مگر لبرل پروگریسیو فرنٹ اور نیشلسٹ پروگریسو الائنس نے ۲۰ مئی کو اپنی جزوی فتح کا شاندار جشن منایا جس میں لگنے والے گرجدار نعروں کی گونج سے "ہواؤں کے رُخ" کا اندازہ ہو رہا تھا جو جامعہ سے نکل کر کالجوں کے انتخابات اور پھر ملکی سیاست کا رُخ متعین کریں گی۔

بقیہ۔ ردّ عمل

کرتے ہوئے خبردار کیا کہ اگر اس غیر قانونی طرزِ عمل کو برقرار رکھا گیا تو پھر ملک بھر کے وکلاء اور محنت کش بھی صحافیوں کی جدوجہد میں شریک ہو جائیں گے۔ وکلاء نے مشترکہ بیان میں کہا کہ ۱۳ مئی کو قانون اور انسانی قدروں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چار صحافیوں کو کوڑے مارے گئے۔ ہم سرسری سماعت کی فوجی عدالتوں کے اس رویہ کی مذمت کرتے ہیں جنہوں نے سزائیں سنائے جانے کے صرف ۷ منٹ کے اندر سزاؤں پر عمل بھی کرا دیا۔

بقیہ۔ اظہار خیال

تھا اور وہ تو صرف بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔

اب قطع نظر بھٹو کی ان خدمات سے جو اُس نے بین الاقوامی سطح پر پاکستان، عرب ممالک اور تیسری دُنیا کے لئے سرانجام دیں۔ اور قطع نظر بھٹو کی ان غلطیوں سے جو بقول اس کے مخالفین کے اس سے سرزد ہوئیں جس زاویے سے بھی دیکھیں۔ ملک کے اندر اور باہر ہر فریق کے لئے بھٹو ایک مسئلہ ہے اور وہ بھی کوہ ہمالہ جتنا بڑا

ہم اتفاق کرتے ہیں "مرد جمہوریت" سے جو بھٹو کو بھٹوازم کہتا ہے۔ بھٹو کے حامیوں کی نظر میں بھٹو نام ہے قوم پرستی کے جذبہ کا، ترقی پسندی کا، اور سامراج دشمنی کا۔ لہٰذا بھٹو کے مخالفوں کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کر کے اس مسئلہ کو اصل مسئلہ سمجھتے ہوئے جمہوری اصولوں کے مطابق نمٹائیں، کیونکہ اسی طرح سے پاکستان کی سالمیت اور روشن مستقبل کی ضمانت مہیا ہو سکتی ہے اور یہی ایک طریقہ ہے جس کے مطابق ملک کے موجودہ سنگین بحران میں ملوث ہر ایک فریق اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ بھی کر سکتا ہے ورنہ یہ بات یقینی ہے کہ انجام ہم سب کو بھگتنا ہو گا۔

کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے کی بجائے حقائق کو تسلیم کر کے ہی مسائل کا صحیح حل تلاش کیا جا سکتا ہے ذاتی اور گروہی مفادات پر قومی مفادات کو ترجیح دینے والوں کا نام ہی تاریخ میں زندہ و جاوید لوگوں میں لکھا جاتا ہے کسی تعمیر کے سنگ بنیاد پر صرف نام لکھوا لینے یا کسی کا نام مٹا دینے سے نہ تو کوئی شخص امر ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی شخص کا نام تاریخ کے صفحات پر عوام کے ذہنوں سے محو کیا جا سکتا ہے۔

ہم اب بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ ملک کے موجودہ بحران کو صحیح پس منظر کے ادراک کے ساتھ، دیانت داری سے جمہوری اصولوں کے مطابق ازسرِ نو حل کرنے کی کوشش میں تامّل نہیں کیا جائے گا۔ اور احتساب کے یکطرفہ عمل کو طول دیئے بغیر عام انتخابات کے ذریعے اقتدار فوری طور پر عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دیا جائیگا یہ بات اٹل ہے کہ جب بھی عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے زیادہ دیر محروم رکھا جاتا ہے تو وہ یقیناً غیر جمہوری اور تشدد کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جب ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو نقصان کون لوگ ہوتے ہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

بیگم شوکت اقبال

بقیہ: پشاور ڈائری

کے بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ ہمارے اکثر لوگوں نے اس ڈر سے کہ کہیں اسلامی جمعیت نہ جیت سکے پیپلز والوں کو ووٹ دیئے۔

مگر یہ تمام باتیں الیکشن میں پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جیت کے بعد کہی جا رہی ہیں۔ سنا ہے پشاور یونیورسٹی میں انتخابات کے نتائج کے بعد گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان کے انتخابات ملتوی کر دیئے گئے ہیں اور اخبارات اس سلسلے میں عجیب خبر چھپی ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ میں کہا گیا کہ گومل یونیورسٹی کے رجسٹرار نے اپنے ملحق کالجوں کے پرنسپلوں اور شعبہ جات کے سربراہوں کو جو مراسلہ بھیجا تھا۔ وہ مراسلہ (جس کا نمبر خبر میں درج کیا گیا) اب واپس لے لیا گیا۔

خبر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا جس سے قارئین کو بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ متن بتائے بغیر کوئی خبر نہ تھی مگر اندر والوں نے بتایا کہ پہلے جو مراسلہ جاری ہوا تھا اس میں گومل یونیورسٹی کے انتخابات کا تذکرہ تھا اس لئے یہ ایسا مراسلہ منسوخ سمجھا جاتا ہے۔

انتخابات میں پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر عبداللہ خان یوسف زئی۔ نائب صدر محمد عارف، نائب صدر خاتون مس نصرت عطیہ، سیکرٹری حبیب الرحمان حبیب، جوائنٹ سیکرٹری امان الٰہی، کلچرل سیکرٹری اظہار احمد، اور لٹریری سیکرٹری جمال اکبر انصاری کامیاب ہوئے ووٹوں کا تناسب یہ رہا۔

صدر

۱۔ عبداللہ خان یوسف زئی (پی ایس ایف) ۱۳۰۶

۲۔ محمد خالد (پختون اسٹوڈنٹس) ۹۲۳

۳۔ افتخار درانی (اسلامی جمعیت طلبہ) ۸۹۸

۴۔ اسلالت آفریدی (پختون اسٹوڈنٹس پروگریسیو گروپ) ۱۳۲

۵۔ نفیس بولٹرا (تحریک استقلال اسٹوڈنٹس) ۴۲

جنرل سیکرٹری

۱۔ حبیب الرحمان (پی ایس ایف) ۱۳۱۴

۲۔ لالہ محمد اقبال (پختون اسٹوڈنٹس) ۹۳۷

۳۔ مشتاق احمد جدون (اسلامی جمعیت طلبہ) ۷۹۰

OO

بقیہ: اپیل
صفحہ ۸ سے آگے

ذرائع ابلاغ اور اخبارات

کے ذریعے معاندانہ ماحول پیدا کر دیا گیا

سے کئے جانے والے مخصوص سوال کی بنا پر کی گئی ہے تو یہ کوئی تضاد نہیں، یہ جوابات، ان حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی جن میں یہ اصلاحات کی گئیں، ناقابل دفاع تھے۔ مستغیث امکانی طور پر ایسے سوالات کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ قانون کے تحت اسے اپنے گواہوں سے ایسے سوالات کرنے کی اجازت تھی۔

(د) سامع بنچ نے اپنے آخری فیصلے میں کہا ہے کہ گواہوں کی شہادتوں میں ہونے والی اصلاحات محض تفصیلی امور ہیں لہٰذا تضادات کی حد تک نہیں ہیں۔ تاہم یہ معزز عدالت بخوشی یہ دریافت کرے گی کہ سامع بنچ کی بیشتر اہم تحقیقات کی بنیاد یہی اصلاحات ہیں۔ اور جو اہم سوالات ملزمان سے زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطۂ فوجداری کئے گئے تھے وہ بھی انہیں فروگذاشت اور اصلاحات پر مبنی تھے جن پر سامع بنچ اعتماد نہ کر سکی، اس معزز عدالت کی توجہ بہت ساری مثالوں میں سے درج ذیل چند مثالوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے:

(اوّل) گواہ استغاثہ نمبر ۲ مسعود محمود نے عدالت میں اپنے بیان (ص ۳۰) میں کہا:

"میں میاں محمد عباس سے کہتا رہا تھا کہ وہ مسٹر ویلچ سے ان اقدامات سے متعلق دریافت کریں جو انہوں نے مسٹر احمد رضا قصوری سے متعلق انہیں دی گئی ہدایات کے مطابق انہوں نے کئے ہوں۔ اس دستاویز میں دیئے گئے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر ویلچ اپنا فرض انجام نہیں دے سکے تھے۔"

انہوں نے اپنے دو سابقہ بیانات میں سے کسی میں بھی اس کا حوالہ نہیں دیا تھا کہ سامع بنچ نے اس اصلاح کو اپیل کنندہ کے خلاف ایک اہم امدادی شہادت کے طور پر قبول کیا ہے جیسا کہ فیصلے کے پیرا ۴۶۱ تا ۴۸۴ سے ظاہر ہوتا ہے۔

(دوم) گواہ استغاثہ نمبر ۲ مسعود محمود نے اپنی شہادت کے صفحہ ۷۴ پر یوں لکھا ہے۔

"۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو میں ملتان میں تھا اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بھی وہیں تھے۔ انہوں نے صبح تڑکے مجھے فون کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تمہارے میاں عباس نے صورتحال کو گول کر دیا۔ مسٹر احمد رضا قصوری کے بجائے اس کے باپ کو مروا ڈالا، مجھے حیرت ہوئی۔ وزیر اعظم نے یہ کہہ کر ٹیلی فون رکھ دیا کہ میں بعد میں تمہیں طلب کرونگا۔

اس کے بعد مجھے ملتان میں مسٹر صادق حسین قریشی کے مکان پر بلوایا جہاں مجھے مسٹر بھٹو کے سامنے لے جایا گیا۔ مسٹر بھٹو نے مجھ سے انتہائی لاتعلقی سے کہا جیسے کہ پہلے ان سے اس سلسلے میں میری بات ہی نہ ہوئی ہو، میں نے سنا ہے کہ کل رات لاہور میں کسی جگہ مسٹر احمد رضا قصوری کے والد کا قتل ہو گیا ہے، میں نے جواب دیا کہ میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔"

اس گواہ نے اپنے دو سابقہ بیانوں میں جو زیر دفعہ ۱۶۴ ضابطۂ فوجداری قلمبند کئے گئے تھے، کہیں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا تھا۔ اپیل کنندہ سے سوال ۴۲ زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطۂ فوجداری انہیں اصلاحات سے متعلق کیا گیا تھا اور سامع بنچ نے ان اصلاحات کو اپیل کنندہ کے خلاف فیصلے کے پیراگراف ۵۸

(سوم) گواہ استغاثہ نمبر ۲ مسعود محمود نے اپنی شہادت کے صفحہ ۷۵ میں یوں کہا:-

میں نے ان سے کہا "آپ کے اشارے پر آپ کا تیار کردہ ایک تصور عمل میں لایا گیا اور اس کا پیغام میں نے میاں عباس کو پہنچایا جسے پہلے ہی میرے پیش رو کے ذریعے آپ کی ہدایات مل چکی تھیں اور یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ میں اور آپ دونوں اور میرے ماتحت لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے لیکن اب

ایسے کسی اور حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔"

یہ بات بھی ان کے سابقہ بیانات میں نہیں کہی گئی تھی (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۹) سوال ۵۴ زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری۔ اسی بیان کی بنیاد پر تشکیل اور اپیل کنندہ کو پیش کیا گیا تھا اور اپیل کنندہ کے خلاف فیصلے کے پیراگراف ۵۹ میں اسی پر توجہ دی گئی ہے

(چہارم) گواہ استغاثہ ۲ مسعود محمود نے صفحہ ۱۰۳ پر کہا ہے:

"اگست ۱۹۷۴ء میں مسٹر احمد رضا قصوری پر اسلام آباد میں حملے کے بعد مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے یاد دلایا کہ کوئی واضح بات ہو نہیں سکی (کچھ نہیں ہوا) ان کا اشارہ محذوف تھا۔ میں نے میاں عباس کو یاد دلایا اور انہوں نے کہا حکم کی تعمیل ہوگی، لہٰذا اس سے بھی میری تائید ہوتی ہے"۔

ان الزامات کا کوئی ذکر ان کے کسی سابقہ بیان میں نہیں تھا تاہم اپیل کنندے سے ان کی جرح کے دوران انہیں الزامات پر مبنی سوال ۳۰ زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری پوچھا گیا جو اپیل کنندے کے حق میں سخت مضرت رساں تھا۔

(پنجم) گواہ استغاثہ نمبر ۳ سعید احمد کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۱۲ میں یوں کہتے ہیں:-

"خط نمبر پی ڈبلیو ۳/۳ سے میں الجھن میں پڑ گیا کیونکہ ان میں مذکور تھا کہ چینی اسلحہ ایف ایس ایف کے استعمال میں ہیں۔ اور مجھے وزیر اعظم نے مثبت ہدایات دی تھیں کہ ایف ایس ایف کا نام الگ رکھا جائے، میرے پاس وزیر اعظم کے پاس واپس جانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا اور میں نے ان سے ملاقات کر کے انہیں سیکرٹری دفاع کا یہ ڈی او لیٹر دکھایا اور پوچھا کہ کیا یہ خط ٹریبونل میں پیش کیا جائے۔ اس پر مسٹر بھٹو مشتعل ہو کر بولے "میں نے تمہیں اپنے تحفظ کے لئے بھیجا ہے یا مجھے الزام میں ملوث کرنے کے لئے؟ یہ خط یقیناً ٹریبونل میں پیش نہیں کیا جائے گا۔ تم حد سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم نے اپنا رویہ درست نہیں رکھا تو نتائج بھگتو گے جسے تمہاری اولاد بھی فراموش نہیں کر سکے گی"۔

بڑی حیرت کی بات ہے کہ اتنا اہم بیان بھی ان کے سابقہ بیانات میں کہیں موجود نہیں تھا۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ سعید احمد خاں جیسا ایک آدمی اپنے دونوں سابقہ بیانات میں اس کا ذکر کرنے سے رہ جاتا تاہم اسی جھوٹے بیان پر مبنی ایک سوال اپیل کنندے سے زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری بطور سوال ۵۲ کے کیا گیا اور میرے خلاف فیصلے کے پیرا ۸۴ میں اس پر اعتماد کیا گیا ہے۔

(ششم) گواہ استغاثہ نمبر ۳ سعید احمد نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۱۹ میں مزید کہا:

"اس پر احمد رضا قصوری گھوم کر رخ بدلتے ہوئے بولے کہ میں اس پارٹی میں کیونکر شریک ہو سکتا ہوں جس کا چیئرمین زیڈ اے بھٹو ہے جو میرے باپ کے قتل کا ذمہ دار ہے اور میرے خون کے درپے ہے۔ میں نے کہا یہی تو اور بھی بڑی وجہ ہے کہ آپ مسٹر بھٹو سے بنا کر لیں اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیں کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ آپ ایک معروف آدمی ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ ایک ہونہار جوان آدمی ہیں، ایک مستقبل رکھتے ہیں اگر آپ دوبارہ پی پی پی میں شریک ہو جاتے ہیں تو دوبارہ سرفراز ہو سکتے ہیں۔ اس پر مسٹر احمد رضا قصوری نے کہا کہ مجھے اس پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت دیا جائے۔ کئی دنوں کے بعد وہ پھر میرے پاس آ کر کہنے لگے کہ تمہاری رائے مستحکم ہے تم وزیر اعظم کو مطلع کر سکتے ہو کہ میں پی پی پی میں شمولیت اختیار کرنے کو تیار ہوں اور مسٹر بھٹو سے ملنا پسند کروں گا"

یہ بیان اپنی صورت ہی سے غیر معقول معلوم ہوتا ہے یہ ممکن نہیں کہ وزیر اعظم کا چیف سیکورٹی آفیسر حکومت کے ایک مخالف سے ایسی باتیں کرے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے سابقہ بیانات میں سے کسی میں بھی یہ الزامات عائد نہیں کئے ... تھے مگر سوال نمبر ۶۲ انہیں پر مبنی تھے جو اپیل کنندے سے زیر دفعہ نمبر ۳۴۲ ضابطہ فوجداری پوچھا گیا اور سامع بنچ نے فیصلے کے پیراگراف نمبر ۹۲ اور نمبر ۵۲۴ میں اپیل کنندے کو جرم میں ملوث کرتے ہوئے انہیں کا حوالہ دیا ہے اور انہیں پر بھروسہ کیا ہے

(ہفتم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ ایم آر ویلچ نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۸۱ میں یوں کہا ہے۔

"میں ایک گھناؤنا قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور مسٹر مسعود محمود کے احکامات کو عمل میں نہ لانے کے لئے کوئی معقول عذر پیش کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس حقیقت کا سہارا لیا کہ مسٹر احمد رضا قصوری اچھی طرح تحفظ میں ہوتے ہیں۔ میں نے اسی کو اپنا عذر بنایا۔ مجھے امید تھی کہ مسٹر مسعود محمود اس کا مفہوم سمجھ جائیں گے اور ان احکامات پر میرے عمل نہ کرنے کی وجہ معلوم کر لیں گے"۔

یہ سب انہوں نے اپنے سابقہ بیان میں نہیں کہا تھا سامع بنچ نے اس اصلاح کا حوالہ دیا ہے اور اس پر اعتماد کیا ہے جیسا کہ اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۱۱، نمبر ۴۸۰ اور ۴۸۳ سے ظاہر ہوگا۔ اتفاق سے اس معزز عدالت کو یہ جان کر مسرت ہو سکتی ہے کہ یہ گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ کے بیان میں یہ اصلاح گواہ استغاثہ نمبر ۲ کی ایک ایسی ہی اصلاح کی تائید کے لئے کی گئی تھی۔ جیسا کہ اوپر (۱) میں حوالہ دیا جا چکا ہے اور سامع بنچ نے اس کو اسی طور پر اختیار کیا ہے۔

(ہشتم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ محمد اصغر نے عدالت میں اپنی شہادت کے صفحہ ۳۶۲ میں یوں کہا ہے:-

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے دو یا تین دن بعد کی بات ہے کہ جب میں سول پولیس اسٹیشن میں ڈی آئی جی سردار عبدالوکیل کے ساتھ بیٹھا تھا کہ مسٹر عبدالحمید باجوہ آئے انہوں نے پھر یہی کہا کہ مسٹر بھٹو کے نام کو الگ رکھا جا سکتا ہے بہتر ڈی آئی جی اور میں نے ان سے کہا کہ یہ ممکن نہیں انہوں نے ڈی آئی جی سے ان خولوں کے متعلق دریافت کیا جو جائے وقوع پر ملے تھے ڈی آئی جی نے انہیں بتایا کہ انہیں معقول طور پر سر بمہر کر دیا گیا ہے۔

مسٹر عبدالحمید باجوہ نے ریمارک کیا کہ ان خولوں کو سربمہر کرنے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے ان خولوں سے متعلق کیوں پوچھا تھا۔ اس گواہ نے زیر دفعہ نمبر ۱۶۱ ضابطۂ فوجداری اپنے بیان میں اس کہانی کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا تھا تاہم یہ سب کچھ اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیراگراف نمبر ۲۱۲ میں استعمال کیا گیا ہے۔

(نہم) شہادت کے ریکارڈ کے صفحات ۳۶۰، ۳۵۹ میں گواہ استغاثہ محمد اصغر نے یوں کہا۔

"مسٹر قصوری کچھ جذباتی ہو گئے اور کہا کہ میرے خیال کے مطابق حقیقی مجرم بھٹو ہے اور جب تک اس کا نام ایف آئی آر میں درج نہیں کیا جاتا تب تک میں اس کیس کا اندراج نہیں کراؤں گا میں نے اُن سے استدعا کی کہ وہ اپنا تحریری بیان دیں اسی کو ایف آئی آر میں پیش کر دیا جائیگا" انہوں نے یہ سب کچھ اپنے بیان زیر دفعہ ۱۶۱ ضابطۂ فوجداری میں ذکر نہیں کیا تھا پھر بھی سامع بنچ نے اسے فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۰ میں اپیل کنندے کے خلاف ایک شہادت کے طور پر قبول کیا ہے۔

(دہم) اسی طرح گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ محمد اصغر نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۳۶۱ میں یوں کہا ہے :-

"۱۱-نومبر ۱۹۷۴ء کی شام کو آئی جی کے مکان پر ایک میٹنگ ہوئی اس میٹنگ میں میرے علاوہ آئی جی پولیس، عبدالحمید باجوہ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی آئی جی پولیس نے شرکت کی تھی۔ آئی جی نے مجھے حکم دیا کہ نواب محمد احمد خان کی لاش ان کے مکان سے ہٹا کر کہیں دفن کر دی جائے مجھ سے توقع کی گئی کہ اس حکم کی تعمیل رات کے وقت کروں گا۔ اس وقت راؤ عبدالرشید خان انسپکٹر جنرل آف پولیس تھے۔ میں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ آئی جی پولیس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر کوئی بات ہو گئی تو دوسرے دن مجھ سے باز پرسی ہو گی۔ مجھے اُس سے جگہ سے چلے جانے کا حکم دے دیا گیا۔"

قطع نظر اس کے کہ انسپکٹر جنرل آف پولیس کو گواہ استغاثہ کے طور پر کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ نے یہ جھوٹی باتیں اپنے سابقہ بیانات میں نہیں کہی تھیں۔ تاہم انہیں اپیل کنندے کے خلاف شہادت کی حیثیت دی گئی۔ انہیں بیانات کی بنیاد پر سوال نمبر ۳۳۴ تشکیل دیا گیا تھا اور اپیل کنندے سے پوچھا گیا تھا یہ بیانات فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۲ میں اپیل کنندے کے خلاف بطور شہادت اختیار کئے گئے ہیں۔

(یازدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ عبدالوکیل خان ڈی آئی جی پولیس نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۳۸۴ میں یوں کہا :-

"میں جانتا تھا کہ عبدالحمید باجوہ ایف ایس ایف سے قریبی تعلق رکھتے تھے اسی لئے میں خولوں سے نمٹنے سے متعلق کسی بھی تجزیہ سے میں انہیں الگ رکھنا چاہتا تھا تاکہ ایف ایس ایف کو بری الذمہ رکھا جائے۔"

انہوں نے دفعہ ۱۶۱ ضابطۂ فوجداری کے تحت اپنے بیان میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس غلط بیان پر اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیراگراف ۲۱۲ میں اعتماد کیا گیا ہے۔

نوٹ : عبدالوکیل خان کا مذکورہ بالا بیان وہ متن ہے جس کی قائم مقام چیف جسٹس نے مزید اصلاح کر دی ہے تاکہ اپیل کنندے کے خلاف مزید ضرر رساں ہو جائے جیسا کہ اپیل کنندے کی درخواست مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء میں کہا جا چکا ہے)

(دوازدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۴ سردار عبدالوکیل خان نے اپنی شہادت کے صفحہ ۳۸۵ میں کہا ہے :

"مجھے یاد ہے مسٹر احمد نے تقریباً دو ہفتے کے بعد مجھ سے ملاقات کی اس وقت میں نے اُن سے پوچھا کہ بالسٹک ایکسپرٹ کو خول بھیجے گئے تھے کیا اس کا کوئی نتیجہ معلوم ہوا ہے مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے ان خولوں کے بھیجنے میں تاخیر کر دی تھی۔ کیونکہ ان خولوں کو مسٹر عبدالحمید باجوہ لے گئے تھے پھر انہوں نے دو تین دنوں کے بعد واپس کئے اس کے بعد ان خولوں کو جانچ پڑتال کے لئے بھیجا گیا۔ میں مسٹر احمد پر خفا ہوا اور پوچھا کہ آپ نے ان خولوں کو مسٹر عبدالحمید باجوہ کے حوالے کیوں کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مسٹر باجوہ نے مجھ سے رابطہ قائم کر کے کہا تھا کہ ان خولوں کو پرائم منسٹر ہاؤس لے جایا جائے گا جہاں اعلیٰ احکام کو دکھایا جائے گا۔ میں نے اسی دھمکی کی وجہ سے وہ خول ان کے حوالے کر دیئے۔"

اس عجیب و غریب من گھڑت کہانی کا ان کے سابقہ بیان میں جو انہوں نے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت یا ضابطۂ فوجداری کی دفعہ نمبر ۱۶۴ کے تحت دیا تھا کہیں کوئی ذکر نہیں تاہم اس گواہ کی اس بعد از وقت اصلاح کو سامع بنچ کے فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۸ نمبر ۳۱۴ اور نمبر ۴۲۴ میں اپیل کنندہ کو ملوث کرنے والی ایک شہادت کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ ان الزامات کی بنیاد پر اپیل کنندے سے ضابطۂ فوجداری کے تحت کوئی سوال تک نہیں پوچھا گیا۔

(سیزدہم) پھر یہی اعلیٰ منصب پولیس افسر اپنی شہادت کے صفحہ ۳۸۷ میں کہتا ہے۔

"اس نے (مسٹر باجوہ) مجھ سے خاص طور پر ان خولوں سے متعلق دریافت کیا جو جائے وقوع پر پائے گئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ جائے وقوع پر پائے جانے والے خول ۷.۶۲ ایم ایم کیلیبر کے تھے۔"

اس اصلاح کا بھی ان کا بیان زیر دفعہ ۱۶۱ یا ۱۶۴ ضابطۂ فوجداری میں سے کسی میں کوئی ذکر نہیں مگر سامع بنچ نے اُسے بھی فیصلے کے پیرا نمبر ۲۱۸ میں اپیل کنندے کے خلاف استعمال کیا ہے۔

(چہاردہم) گواہ استغاثہ نمبر ۱۲ امیر بادشاہ اپنی شہادت کے صفحہ ۵۶۴ میں کہتے ہیں :-

میاں عباس نے مجھے ٹیلی فون پر حکم دیا تھا کہ غلام مصطفےٰ کو فراہم کئے جانے والے ہتھیاروں اور گولہ بارود کی ایک رسید لے لوں اور رجسٹر میں ان کا اندراج نہ کروں۔"

انہوں نے اس قدر اہم بات کا کوئی تذکرہ نہ تو اپنے زیر دفعہ نمبر ۱۶۱ ضابطۂ فوجداری نہ ہی زیر دفعہ ۱۶۴ ضابطۂ فوجداری کے بیان میں کیا گیا تھا سامع بنچ نے ان اصلاحات کو اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیرا

نمبر ۱۹۲ اور نمبر ۲۶۹ ہم میں استعمال کیا ہے۔

(پنجند ہم) گواہ استغاثہ نمبر ۴۲ افضل علی اپنی شہادت کے صفحہ نمبر ۴۸۹ میں لکھتے ہیں۔

اوائل اگست ۱۹۷۴ء میں ایف ایس ایف کا انسپکٹر غلام حسین، ڈائریکٹر محمد عباس ایک چٹ لیکر آیا۔ جس میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ کہ ایک اسٹین گن، دو میگزین، ساٹھ راؤنڈ اور ایک پستول غلام حسین انسپکٹر کو خصوصی ڈیوٹی کے لئے دیئے جائیں۔ میں نے ان چیزوں کا اندراج عارضی طور پر دیئے جانے والے ہتھیاروں کے رجسٹر میں کرنا چاہا۔ لیکن غلام حسین نے کہا کہ ڈائریکٹر محمد عباس نے یہ حکم دیا ہے کہ یہ اسلحہ اور گولہ بارود غلام حسین کی دی ہوئی ایک کچی رسید پر دے دیئے جائیں۔ اور جب یہ اسلحہ اور گولہ بارود واپس کئے جائیں گے اس وقت غلام حسین وہ رسید واپس لے لے گا۔ اور یہ کہ ان ہتھیاروں اور گولہ بارود کا اندراج رجسٹر میں نہیں ہوگا۔ میں نے اُسے یہ اسلحہ اور گولہ بارود جاریہ احکامات کے تحت دینے سے انکار کر دیا لیکن غلام حسین نہ مانا۔ غلام حسین انسپکٹر خفا ہو کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر مجھ سے بولا کہ ڈائریکٹر میاں محمد عباس نے تمہیں طلب کیا ہے میں اس کے ساتھ میاں محمد عباس کے پاس گیا میں جوں ہی ڈائریکٹر میاں محمد عباس کے دفتر کے کمرے میں داخل ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے میرا حکم کیوں نہیں مانا۔ میں نے کہا کہ چونکہ وہ حکم جاریہ احکامات کے مطابق نہیں تھا اس لئے میں نے اسلحہ اور گولہ بارود نہیں دیئے ڈائریکٹر چیخ کر کہنے لگا کیا تم اب نوکری کرنا نہیں چاہتے۔ میں تمہیں ملازمت سے نکال دوں گا اور تم اپنے گھر بھی واپس پہنچ سکو گے۔ اس نے مجھے پھر حکم دیا کہ فی الفور وہ اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرو ورنہ تمہاری ملازمت ختم کر دی جائے گی۔ تب میں نے غلام حسین کی دی ہوئی رسید پر وہ اسلحہ اور گولہ بارود دے دیئے۔"

الف لیلہ کی یہ لمبی کہانی فضل علی نے پہلی مرتبہ کورٹ میں کہی لیکن ضابطہ فوجداری کی دفعہ نمبر ۱۶۱ کے تحت اس نے پہلے جو بیان دیا تھا۔ اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ بعد کی گھڑی ہوئی کہانی وعدہ معاف گواہ غلام حسین کی اصلاح شدہ کہانی کی تائید کے لئے تھی ایک دوسرے جھوٹ کی تائید کرنے کے لئے یہ دوسرا جھوٹ تیار کرنا پڑا تھا۔ انہیں حقائق کی بنیاد پر سماعت کرنے والی بنچ نے ملزم میاں محمد عباس سے سوالات نمبر ۱۶ اور نمبر ۱۷ پوچھے تھے اور اپیل کنندے کو نقصان پہنچانے کے لئے فیصلے کے پیرا نمبر ۱۸۲، نمبر ۱۸۶، نمبر ۴۱۶، نمبر ۴۲۹، نمبر ۴۳۲، نمبر ۴۴۴، نمبر ۴۴۲ اور نمبر ۴۴۸ میں استعمال کئے تھے۔

(ششدہم) گواہ نمبر ۴۲ فضل علی نے اپنی شہادت کا صفحہ ۴۹۱ پر کہا۔

"اسی ماہ کے اختتام سے دو دن پہلے غلام حسین انسپکٹر نے سارے ہتھیار اور گولہ بارود واپس کر دیئے"

اس نے دفعہ ۱۶۱ ضابطہ فوجداری کے تحت جو بیان دیا تھا اس میں یہ نہیں کہا تھا۔ سامع بنچ نے اپنے اخذ کردہ نتائج کی تائید میں اُسے استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو پیرا نمبر ۱۳۰، نمبر ۱۸۷، نمبر ۴۱۶، نمبر ۴۲۹، نمبر ۴۴۴، نمبر ۴۴۸ اور نمبر ۴۸۸۔ ملزم میاں عباس سے سوال نمبر ۲۵ اسی اصلاح کی بنیاد پر پوچھا گیا تھا۔

(ہفدہم) پھر یہی گواہ فضل علی شہادت کے صفحہ نمبر ۴۹۱ میں کہتے ہیں۔

"۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء سے دو یا تین دن پہلے غلام حسین انسپکٹر انچارج کمانڈو کورس میرے پاس وہ گولہ بارود واپس کرنے آیا۔ جو اسے ۹ مئی ۱۹۷۴ء کو دیئے گئے تھے۔ جب میں نے استعمال شدہ گولہ بارود کا جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ پچاس سے اکیاون تک ایس ایم جی کے خول کم تھے۔ نتیجتہً میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں ان کے لائے ہوئے گولہ بارود اسی صورت میں قبول کروں گا جب کہ وہ ان گم شدہ خولوں کے کیسوں کا حساب دیں۔ لہٰذا وہ اسے واپس لے گئے پھر وہ ۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء کو ان گولے بارود کے ساتھ واپس آئے۔ میں نے ان کا پھر جائزہ لیا اور دیکھا کہ انہیں صحیح تعداد میں واپس کیا جا رہا ہے"۔

یہ خیالات مابعد پر مبنی کہانی انہوں نے پہلی مرتبہ عدالت میں سنائی اس کا کوئی ذکر ان کے اس بیان میں نہیں تھا جو انہوں نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت دیا تھا یہ کہانی وعدہ معاف گواہ غلام حسین گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ کے اصلاح شدہ متن کی تائید میں بیان کی گئی تاکہ اس دستاویز کو غلط ثابت کیا جا سکے۔ جس سے پشاور میں اس کی موجودگی ثابت ہوتی تھی سامع بنچ نے اس کہانی کی بنیاد پر سوال نمبر ۵۶ ترتیب دیا۔ اور میاں عباس سے پوچھا اس اصلاح کو فیصلے کے پیرا نمبر ۱۸۸۔ اور نمبر ۴۱۳ میں قابلِ غور سمجھا گیا جس سے اپیل کنندے کو نقصان پہنچا۔

(ہیزدہم) گواہ استغاثہ فضل علی نے اپنی شہادت کے صفحہ ۴۹۲ میں کہا۔

"خولوں کے ۴۰ یا ۵۰ بکس اسلحہ خانے میں جمع ہو جانے پر انہیں واہ فیکٹری بھیج دیا جاتا ہے غلام حسین کے ۱۵۰۰ فائر کئے ہوئے راؤنڈ جمع کرانے سے آٹھ دس دن بیشتر مجھے میاں عباس نے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ میاں عباس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اسلحہ خانے میں فائر کئے ہوئے کارتوس ہوں گے میں نے ان سے کہا کہ تمام ہتھیاروں کے فائر کئے ہوئے کارتوس اسلحہ خانے میں پڑے ہوتے ہیں۔ میرا جواب سن کر میاں عباس نے مجھ سے ایس ایم جی، ایل ایم جی کے ۲۵۔ ۳۰ فائر کئے ہوئے کارتوس لانے کو کہا۔ میں اسلحہ خانے میں واپس گیا اور ایس ایم جی، ایل ایل جی کے تیس خول ڈائریکٹر کے پاس لے گیا ڈائریکٹر نے مجھے حکم دیا کہ ان خولوں کو ان کی میز پر رکھ دوں اس لئے کہ وہ اس وقت کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے بتائیں گے کہ ان کارتوسوں کو میں کب واپس لے لوں۔ ڈائریکٹر میاں محمد عباس نے ۲ یا ۲½ گھنٹے کے بعد مجھے پھر طلب کیا اور وہ خول واپس لے جانے کے لئے کہا۔ میں

نے ان خولوں کو گنادہ تبس تھے۔ میں نے انہیں لاکر اسلحہ خانے میں دوبارہ جمع کر دیا۔"

یہ بیان استغاثہ کے کیس میں تبدیلی کے باعث دیا گیا کیونکہ بالسٹک ایکسپرٹ کی منفی رپورٹ سے استغاثہ کا کیس خراب ہو گیا تھا۔ اس بیان کا بھی دفعہ ۱۶۱ ضابطہ فوجداری کے تحت دیئے گئے بیان میں کہیں کوئی ذکر نہیں۔ یہ جرائم کے خولوں کی تبدیلی سے متعلق بعد کی کہانی سے مطابقت کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اپیل کنندے سے اس کہانی کی بنیاد پر کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا پھر بھی سامع بنچ نے فیصلے کے پیرا نمبر ۴۲۹ اور ۴۳۱ میں فضل علی کے اس اصلاح شدہ متن پر اعتبار کیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جرم کے خولوں کو ملزم میاں محمد عباس نے تبدیل کر دیا تھا۔ جرم کے خولوں کی اس تبدیلی کو اپیل کنندے کے خلاف بطور ایک شہادت کے قبول کیا گیا جس سے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی شہادت کی تائید اس طور پر ہوئی کہ اپیل کنندے کا ارتکاب جرم سے تعلق قائم ہو گیا۔

(نوزدہم) گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین وعدہ معاف گواہ نے اپنی شہادت صفحہ ۵۲۷ میں کہا:

"کاغذات کے اعتبار سے میری تعیناتی بٹالین ۵ میں تھی لیکن میاں محمد عباس نے زبانی طور پر یہ حکم دے دیا تھا کہ میں صدر مقام میں ان کے تحت کام کروں۔"

اس نے ایسا کوئی الزام اپنے دو سابقہ بیانات مؤرخہ ۱۱۔ اگست ۱۹۷۷ء اور ۱۷ر اگست ۱۹۷۷ء میں عائد نہیں کیا تھا یہ جھوٹ ایف ایس ایف کے سرکاری ریکارڈ کو باطل کرنے کے لئے گھڑا گیا تھا اور ایک یہ کیس بنانا مقصود تھا کہ گواہ براہ راست میاں محمد عباس کے تحت کام کر رہا تھا اسی اصلاح کی بنا پر میاں محمد عباس سے سوال نمبر ۵ کیا گیا تھا اور سماعت کرنے والی بنچ نے اپیل کنندے کے خلاف پیرا نمبر ۱۷ میں اس بنا پر اعتبار کیا ہے۔

(بیستم) گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین نے شہادت کے صفحہ نمبر ۵۲۸ میں کہا:

"کیمپ میں تربیت پانے والے تربیت کی غرض سے اپنی بٹالین سے اپنے لئے اسلحہ لاتے تھے۔

اور ان کے لئے گولہ بارود ایف ایس ایف کے صدر مقام کے اسلحہ خانہ واقع نمبر ۵۰ اے سٹلائٹ ٹاؤن سے حاصل کئے جاتے تھے۔

ان میں سے کسی کا بھی کوئی ذکر اس کے علاوہ دو سابقہ بیانات میں نہیں تھا۔ سوال نمبر ۸ اسی کی بنیاد پر تیار کیا گیا اور میاں محمد عباس سے پوچھا گیا تھا۔ اس اصلاح کو بھی اپیل کنندے کے خلاف فیصلے کے پیرا نمبر ۱۱۸ میں استعمال کیا گیا ہے۔

(بیست ویکم) گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین نے اپنی شہادت صفحہ نمبر ۵۳۱ میں میاں محمد عباس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

"اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک چٹ دی اور ہدایت کی کہ صدر مقام اسلحہ خانے کے انچارج فضل علی سے ایک اسٹین گن ایک پستول دو میگزین اور گولہ بارود حاصل کروں میں وہ چٹ فضل علی کے پاس لے گیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس سامان کے دینے کا اندراج رجسٹر میں نہ کرے کیونکہ میاں محمد عباس کا یہی حکم ہے بلکہ یہ سامان ایک رسید کی بنیاد پر دے۔ جو میں اسے دینے والا تھا۔ فضل علی نے اصرار کیا کہ وہ یہ سامان اسی صورت میں دے گا جب کہ رجسٹر میں اس کا اندراج ہو۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ میں میاں محمد عباس کی ایک چٹ لیکر آیا ہوں اور میں یہ سامان ان کے دیئے ہوئے حکم کے بموجب طلب کر رہا ہوں لیکن اس نے چونکہ دینے سے انکار کیا اس لئے میں وہ چٹ لے کر میاں محمد عباس کے پاس لوٹ آیا۔ میں نے انہیں چٹ واپس دیتے ہوئے کہا کہ فضل علی کوئی سامان پہلے رجسٹر میں درج کئے بغیر دینے کو تیار نہیں۔ میاں صاحب نے مجھے فضل علی کو لانے کا حکم دیا۔ اس حکم کے مطابق میں فضل علی کو میاں صاحب کے دفتر میں لے گیا میاں صاحب نے اس کے سامنے وہ حکم دہرایا اور کہا کہ اگر اس نے رجسٹر میں اندراج کئے بغیر مطلوبہ اسلحہ اور گولہ بارود دینے کے متعلق ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی تو اسے نہ صرف اپنی ملازمت سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بلکہ وہ (میاں صاحب) اس سے بری طرح پیش آئیں گے۔ یہ سن کر فضل علی ان کے حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گیا اور وہ اور میں دونوں اسلحہ خانہ چلے گئے اسلحہ خانہ پہنچ کر فضل علی نے ایک اسٹین گن، دو میگزین، ایک پستول اور دونوں کے لیے گولہ بارود میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے اسے ایک رسید دے دی اور میں یہ چیزیں اپنے کمانڈو کیمپ لے گیا۔"

اس طرح اسلحہ اور گولہ بارود دینے کے قائم شدہ طریقے یعنی اس مقصد کے لیے موجودہ رجسٹر میں اندراج کے بعد دینے کے طریقے کی نفی کرنے کے علاوہ وعدہ معاف گواہ غلام حسین نے عدالت میں پہلی مرتبہ اس وقت کہی جب اس واقعے کو تین سال گزر چکے تھے اور اس کے سابقہ بیانات میں اس کا کوئی ذکر تک نہیں تھا۔ سوال نمبر ۱۶ اور نمبر ۱۷ اسی کہانی کی بنیاد پر تیار کیے گئے تھے جو میاں محمد عباس سے پوچھے گئے۔ سماعت کرنے والی بنچ نے پیرا ۱۲۳، نمبر ۴۲۹، نمبر ۴۳۲، نمبر ۴۴۲ اور نمبر ۴۸۴ میں انہیں اپیل کنندے کو مجرم قرار دینے کے لیے بطور ایک شہادت کے تسلیم کیا ہے۔

بیست و دوم

غلام حسین گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ نے صفحہ ۵۳۷ میں کہا ہے:

میاں عباس نے مجھے حکم دیا کہ کمانڈو کیمپ کے کانسٹیبل ظہیر اور لیاقت کو لاہور جانے اور ڈاکٹر احمد رضا قصوری کو تلاش کرنے پر مامور کروں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ میں کمانڈو کیمپ میں اپنے کام پر مامور ہو گیا"۔

یہ بھی اس نے اپنے دو بیانات میں سے کسی میں نہیں کہا تھا تاہم سوال نمبر ۲۶ کی تشکیل اسی کی بنیاد پر ہوئی اور میاں عباس سے پوچھا گیا۔ فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۳۷ اور نمبر ۴۸۷ میں اسی بیان پر بھروسہ کرتے ہوئے اپیل کنندے کو ملوث کیا گیا ہے۔

بیست و سوم

گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ وعدہ معاف گواہ غلام حسین نے صفحہ ۵۳۸ میں اپنی شہادت میں کہا:

"میاں محمد عباس نے اکتوبر ۱۹۷۴ء میں عید سے ایک دن پہلے مجھے بلوا بھیجا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میرے جو آدمی لاہور بھیجے گئے تھے وہ چھٹیاں منا رہے ہیں۔ کچھ کیا نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم چونکہ راولپنڈی میں ٹھہرے ہوتے ہو اور کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے

اس وقت کے وزیر اعظم نہیں گالیاں دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں عید کے بعد فوراً لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ تاہم انہوں نے مجھے ہدایت دی کہ فی الفور روانہ ہو جاؤں اور لاہور پہنچ کر انہیں ٹیلیفون کے ذریعہ مطلع کروں کہ میں وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ عید ہی بہترین موقعہ ہے جبکہ میں مسٹر احمد رضا قصوری سے نمٹ سکتا ہوں۔ وہ اس موقعے پر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے ملانے میں مصروف ہوں گے۔ میں نے بٹالین ۲/۴ کے روزنامچے میں اپنی روانگی درج کی اور لاہور روانہ ہو گیا۔ وہاں سے میاں محمد عباس کی ہدایت کے مطابق میں نے انہیں فون کیا اور اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔ میرے واقعی لاہور پہنچنے کی تصدیق کرنے کے لیے میاں محمد عباس نے مجھے ایف ایس ایف ہیڈ کوارٹر شاہ جمال میں فون کیا اور مجھ سے باتیں کیں۔

"میں تقریباً دس دن لاہور میں ٹھہرا اور مسٹر احمد رضا قصوری کے کوائف معلوم کرنے کے بعد میں راولپنڈی واپس چلا آیا جہاں میں نے بٹالین ۲/۴ کے روزنامچے میں اپنی واپسی درج کی۔"

یہ ملوث کرنے والی کہانی اس نے اپنے سابقہ بیانات میں سے کسی میں بھی نہیں سنائی تھی۔ سماعت کرنے والی بنچ نے اس کہانی پر بھی فیصلے کے پیراگراف ۱۳۶ اور ۴۸۶ میں اعتبار کیا ہے۔ اسی بیان کی بنیاد پر سوال ۳۱ مرتب کیا گیا اور اپیل کنندہ سے زیر دفعہ ۳۴۲ ضابطہ فوجداری پوچھا گیا۔

بیست و چہارم

مزید برآں، گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین نے صفحہ ۵۴۳ میں کہا۔

"۔ ار نومبر ۱۹۷۴ء کو رات ۷ اور ۸ بجے کے درمیان میں نے صوفی غلام مصطفےٰ سے کہا کہ ہمیں احمد رضا قصوری کا پتا لگانے کی کوشش اسی دن کرنا چاہیے۔ تاکہ ہم کچھ نتائج دکھا سکیں۔ اس کے بعد غلام مصطفےٰ، افتخار، ارشد اقبال اور میں چاروں ایک جیپ پر سوار ہو کر ماڈل ٹاؤن کی طرف چلے گئے۔ ہم نے مسٹر احمد رضا قصوری کی کار کو اس جگہ دیکھا جہاں ماڈل ٹاؤن شاخوں کا مین روڈ فیروز پور روڈ سے جدا ہوتا ہے۔ ان کی کار فیروز پور روڈ کی طرف جا رہی تھی جبکہ ہم ماڈل ٹاؤن کی طرف گھوم رہے تھے ہم اس کا تعاقب کرنے کے لیے جیپ کو گھما نہیں سکے اس لیے ہم سیدھے ماڈل ٹاؤن میں داخل ہو گئے ہم اس روڈ کی طرف مڑ گئے جو احمد رضا قصوری کے گھر کی طرف جاتا تھا لیکن احمد رضا قصوری کے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہم دائیں کو مڑ گئے اس کے بعد فیروز پور روڈ پہنچ گئے لیکن ہمیں احمد رضا قصوری کی کار دوبارہ نہیں ملی۔"

گواہ نے اپنے دو سابقہ بیانات میں یہ کہانی نہیں سنائی تھی۔ اس کہانی کی بنیاد پر سماعت کرنے والی بنچ نے نہ تو اپیل کنندہ سے نہ ہی میاں عباس سے کوئی سوال کیا لیکن اسے اپیل کے خلاف فیصلے کے پیرا ۴۴۲ میں استعمال کیا ہے۔

بیست و پنجم

گواہ استغاثہ نمبر ۳۱ غلام حسین شہادت کے صفحہ ۵۴۴ میں کہتا ہے۔

"ہم وہاں سے فیروز پور روڈ پہنچے اور اگر میری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو ہم اچھرہ میں ایک پیالی چائے پینے کے لیے رک گئے اور اپنے دفتر شاہ جمال کو لوٹ آئے۔ ہم نے جیپ وہیں چھوڑ دی۔ اور ڈرائیور کو چھوڑ کر ہم چاروں اوپر چلے گئے جہاں ہم رہتے تھے۔ ہم نے صلاح مشورہ کیا۔ چونکہ ہم جانتے تھے کہ ان کی کار وہاں ہے اور وہ بھی وہیں ہیں۔ ہم کوئی ایسی جگہ منتخب کرنے کا منصوبہ بناتے گئے جہاں انہیں قتل کیا جا سکے ہم نے اس جگہ کا انتخاب کیا جو اگر اس مکان کی طرف رخ کر کے کوئی کھڑا ہو جہاں شادی ہو رہی تھی تو دائیں موڑ کی طرف پڑتی ہے۔"

اس کہانی کا بھی استغاثہ کے ممتاز وعدہ معاف گواہ کے دو سابقہ بیانات میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ سماعت کرنے والی بنچ نے اسے بھی ایک ٹھوس گواہی کی حیثیت دی اور اسی کی بنیاد پر سوال نمبر ۴۰ تیار کر کے میاں محمد عباس سے پوچھا۔ فیصلے کے پیرا ۱۴۵ میں اسی پر اعتبار کیا گیا ہے۔

بیست و ششم

گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین اپنی شہادت کے صفحہ ۵۴۶ میں کہتا ہے!

"افتخار کو حکم دیا گیا کہ ارشد اقبال کی ہوائی فائر کے بعد جو پہلی کار اس کے سامنے آئے اس پر گولی چلائے۔ میں نے ارشد اقبال کو ایک سے زائد وجوہ کی بنا پر ہوائی فائر کرنے کی ہدایت دی تھی۔ وہ شامیانہ کے سامنے تھے۔ اگر وہ گولی چلاتے تو اس صورت میں شامیانہ کے اندر لوگوں کو لگ سکتی تھی۔ دوسرے جو لوگ کاروں کے اندر بیٹھے یا راستے پر چل پھر رہے تھے ان کے زخمی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ تیسرے شادی کی جگہ سے آنے والی کاروں کو افتخار چونکہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ہوائی فائر اس کے لیے ایک خبرداری تھی۔"

اس حقیقت سے قطع نظر کہ سامع بنچ نے اسی بیان کے پیش نظر اپیل کنندہ کو ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۱۱ کے تحت مجرم قرار دیا ہے جو وہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان اصلاحات کا جن میں افتخار کو ہوائی فائر کرنے کا حکم دینے کے اسباب بتائے گئے ہیں۔ گواہ کے سابقہ دو بیانات میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے سابقہ بیان مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۷۷ء میں اس نے کہا تھا کہ میں نے ارشد اقبال کو ہوائی فائر کرنے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ مسٹر قصوری کو کوئی زخم نہ لگے۔ پھر بھی سامع بنچ نے اسے ایک ٹھوس شہادت قرار دیا ہے اور اسے فیصلے کے پیراگراف ۱۴۷ اور ۴۰۵ میں اپیل کنندہ کے خلاف استعمال کیا ہے۔

بیست و ہفتم

پھر گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین اپنی شہادت کے صفحات ۵۴۶ اور ۵۴۷ میں کہتا ہے:

"میں موٹر پر متعدد بار آیا تاکہ ارشد اقبال اور افتخار پر نظر رکھوں اور یہ بھی معلوم کروں کہ آیا لوگوں نے اس جگہ سے جانا شروع کیا ہے یا نہیں جہاں شادی ہو رہی تھی۔"

گواہ نے اپنے دو سابقہ بیانات میں یہ بات بھی نہیں کہی تھی لیکن سامع بنچ نے فیصلے کے پیراگراف ۱۴۸ میں اس پر بھی اعتبار کیا ہے۔

بیست و ہشتم

گواہ استغاثہ ۳۱ غلام حسین نے شہادت کے صفحہ ۵۵۱ میں کہا:

"میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کوئی ایسی چیز تو جائے وقوعہ پر نہیں چھوڑی ہے جس سے اس واقعہ میں ایف ایس ایف کا ملوث ہونا ظاہر ہو۔ میں نے کہا کہ استعمال شدہ گولیاں وہیں رہ گئی ہیں کیونکہ تاریکی اور گھاس کی وجہ سے وہ ہمیں نہ مل سکیں۔" (جاری ہے)

سپریم کورٹ میں سابق ڈائریکٹر
انٹیلی جنس بیورو راؤ عبدالرشید کا بیان حلفی

میں نے احمد خان کی لاش کو پوشیدہ طور پر دفن کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا

سعید احمد خان، کسی بڑی مچھلی کو پھنسا کر موٹی موٹی رقمیں وصول کرتے تھے

پاکستان سپریم کورٹ میں
حد اختیارات سماعت فوجداری اپیل
فوجداری اپیل نمبر ۱۱ سنہ ۱۹۷۸ء

بمتعلق :

ذوالفقار علی بھٹو ..... اپیل گذار

بنام

مملکت .... مدعا علیہ

حلفیہ بیان

حلفیہ بیان از ۔ راؤ عبدالرشید
سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو
حکومت پاکستان

میں راؤ عبدالرشید ولد راؤ عنایت علی، مسلم بالغ حال مقیم لاہور بہ صمیم قلب حسب ذیل امور کی تصدیق کرتا اور بیان کرتا ہوں !

۱۔ جب نواب احمد خان کا قتل ہوا تھا تو میں اس وقت بحیثیت انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب متعین تھا وقوعہ کی رات کو میں دوسرے اعلیٰ سرکاری عمال کے ساتھ بسلسلہ دورہ وزیراعظم، ملتان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ میں ریلوے اسٹیشن میں ریلوے سیلون کے اندر ٹھہرا ہوا تھا

۲۔ آدھی رات کے بعد کا کوئی وقت رہا ہوگا۔ جب اس وقت کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل لاہور مسٹر وکیل خان نے مجھے فون کیا اور اس واقعہ کی رپورٹ دی انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مسٹر احمد رضا قصوری ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ انہیں انصاف نہیں ملے گا۔ میں نے وکیل خان سے کہا کہ وہ مسٹر رضا قصوری کو یقین دلائیں ۔ کہ ہم اپنی صلاحیت پوری طرح اس کیس کی تفتیش کریں گے اور یہ کہ انہیں ایف آئی آر درج کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے مسٹر وکیل خان نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ انہوں نے اس معاملے کی رپورٹ وزیراعلیٰ کو کردی ہے اور یہ کہ اسے وزیراعظم کے علم میں بھی لانا چاہیئے ۔ کیونکہ یہ معاملہ ایک سیاسی کیس بن سکتا ہے اس لئے کہ رضا قصوری ایک متنازع سیاستداں ہیں کیونکہ مجھے یہ ہدایت تھی کہ تمام سنگین جرائم کی اطلاع وزیراعظم کو دیا کروں تاہم میں نے اس معاملے کو اتنا اہم نہیں سمجھا کہ آدھی رات کو وزیراعظم کو جگا کر اس کی رپورٹ کروں۔ میں نے صبح ۸ بجکر ۳۰ منٹ پر وزیراعظم کے اے ڈی سی کو فون کیا اور وزیراعظم سے رابطہ قائم کرنے کی خواہش کی لیکن کہا گیا کہ ابھی وزیراعظم تیار نہیں ہوئے ہیں ۔ اور جب وہ مل جائیں گے اس وقت ان کے ساتھ میرا رابطہ قائم کر دیا جائے گا ۔ ۹ بجکر ۳۰ منٹ کے کچھ دیر بعد اے ڈی سی نے وزیراعظم کے ساتھ میرا رابطہ قائم کر دیا اور میں نے اس کی واقعے کی رپورٹ انہیں دے دی ۔ میری بات سننے کے بعد ان کا تبصرہ یہ تھا "کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی" میں نے کہا کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے اس کے بعد مسٹر بھٹو نے مجھ سے کبھی اس کیس سے متعلق کوئی بات نہیں کی ۔ اور نہ انہوں نے اس وقت یا اس کے بعد کبھی اس سلسلے میں مجھے کوئی ہدایت کی ۔ بہر حال مسٹر سعید احمد اور مسٹر باجوہ نے لاہور کا دورہ کیا اور میرے افسروں سے ملاقات کی ۔ مسٹر سعید احمد نے ایک

موقع کے سوا کبھی مجھ سے ملاقات نہیں کی کیونکہ انہیں تجربہ سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے دور رکھنا چاہیے مسٹر سعید احمد خان کو کوئی مقررہ کام تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم وہ محض اپنا وجود ثابت کرنے اور اپنی وفاداری سے وزیر اعظم کو متاثر کرنے کی خاطر وزیر اعظم ہاؤس میں اپنی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر محکمے کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑاتے جب میں نے اسپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ کے انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے چارج سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ عملاً مسٹر سعید احمد ہی اسے اپنی ایجنسی کے طور پر چلا رہے تھے وہ کسی خاص کیس کو سیاسی رنگ دے کر اس کی نگرانی کے لئے وزیر اعظم کی منظوری حاصل کر لیتے اور پھر اسپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ کو استعمال کر کے اس میں کسی بڑی مچھلی کو پھنسا کر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے۔ وہ میرے ماتحتوں کو لاہور اور کراچی طلب کر کے انہیں براہ راست بلا اختیار تحقیقات کا حکم دیتے تاکہ لوگوں کو پریشان کر کے ان سے رقمیں اینٹھ سکیں جب میں نے یہ محسوس کیا تو میں نے اس کی شکایت اس وقت کے وزیر داخلہ اور اسپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ کے انچارج مسٹر قیوم خان سے کی اور انہوں نے مسٹر سعید احمد کے ہاتھوں سرکاری ایجنسیوں کا بیجا استعمال کے خلاف وزیر اعظم سے سخت احتجاج کیا۔ جس کے نتیجے میں کیبنٹ سیکرٹری کے جاری کردہ ایک حکم میں مسٹر سعید احمد خان کو کسی اطلاع کے لئے براہ راست کسی ایجنسی سے رابطہ قائم کرنے سے منع کر دیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ کیبنٹ سیکرٹری کے ذریعہ یہ کام کیا کریں اس کے بعد مسٹر سعید خان کے دل میں میرے خلاف ایک عداوت پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے کبھی مجھ سے ملاقات نہیں کی اس وقت بھی نہیں جب میں نے انسپکٹر جنرل پنجاب کا عہدہ سنبھالا۔

۳۔ لیکن وہ اپنے طریقوں سے باز نہیں آئے صرف اپنے طرز عمل کو زیادہ دقیق بنا لیا۔ وہ پنجاب میں میرے ماتحتوں سے براہ راست معاملات کرتے رہے لیکن مجھ سے ملنے سے ہمیشہ گریزاں رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ وزیر اعظم کے نام کا غلط استعمال کر کے مجھے فریب نہیں دے سکتے۔

۴۔ لاہور کے سابق ایس ایس پی اصغر خان نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ واقعہ کے بعد کی شام کو جب میں ملتان سے واپس آ گیا تھا تو میری رہائش گاہ پر ایک میٹنگ ہوئی تھی جس میں ڈی آئی جی لاہور ڈپٹی کمشنر لاہور کمشنر لاہور ہوم سیکرٹری اور مسٹر حمید باجوہ مرحوم نے شرکت کی تھی۔ اصغر خان نے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ میں نے اُن سے اس شام کہا تھا کہ احمد خان کی لاش کو پوشیدہ طور پر کہیں "دفن کر دیں اور ان کے انکار کرنے پر میں نے انہیں نکال دیا تھا یہ قطعی من گھڑت ہے۔ میری رہائش گاہ پر کوئی میٹنگ نہیں ہوئی تھی۔ سرے سے یہ بات ہی مہمل ہے: میں ڈی آئی جی اور ایس ایس پی کو اپنے گھر پر طلب کر سکتا تھا کیونکہ وہ میرے ماتحت تھے لیکن مجھے اس کا اختیار نہیں تھا کہ ہوم سیکرٹری کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کو اپنے گھر پر کسی میٹنگ میں طلب کرتا ایسی میٹنگ صرف وزیر اعلیٰ یا چیف سیکرٹری ہی طلب کر سکتے تھے۔ ڈی آئی جی مسٹر وکیل خان، ایس ایس پی اس کی تردید کر چکے ہیں اور یہ کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے میری قیام گاہ پر کسی میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی مجھے یقین ہے کہ ہوم سیکرٹری، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر سے بھی اگر پوچھا جائے تو وہ میری تائید کریں گے جہاں تک لاش کو خفیہ طور پر کہیں دفن کر دینے سے متعلق میری ہدایات کا سوال ہے تو یہ مسٹر اصغر کے تصور کی اختراع ہے اگر مسٹر اصغر خان کا مقصد یہ کہنا ہے کہ میں نے کچھ شہادتوں کو تلف کر دینا چاہا۔ تو وہ ایک تجربہ کار پولیس افسر ہو کر بھی خود کو دھوکا دے رہے ہیں ایف آئی آر دائر ہو چکی تھی پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور ڈاکٹر کی رپورٹ موصول ہو چکی تھی۔ اس کی خبر سارے ملک میں پھیل چکی تھی۔ ایسی حالت میں ایک احمق بھی سمجھ سکتا ہے کہ لاش کو خفیہ طور پر دفن کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا حادثے کے ۲۴ گھنٹے گذر جانے کے بعد اگر کسی نے لاش کو تمام رشتہ داروں، دوستوں اور اس کے خاندان کے سیاسی ہمدردوں کے قبضے سے جو اس وقت احمد خان کے گھر پہ مجتمع تھے لینے کی کوشش کرتا تو اس سے امن وامان کا مسئلہ البتہ کھڑا ہو سکتا تھا اصل میں جو ہوا وہ یہ کہ مسٹر احمد رضا قصوری اپنے والد کی موت کے ذریعہ سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے انہوں نے تحریک استقلال پارٹی کے مسٹر اصغر خان کو لاہور بلایا تھا۔ وہ لوگ ناصر باغ میں نماز جنازہ کا انتظام کر رہے تھے اور وہاں سے مال روڈ سے گذرنے کا ارادہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر ایسا ہوا تو جذبات سے بھرا ہوا ہجوم مال روڈ پر بے قابو ہو کر امن وامان کی صورت حال کے لئے مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے مسٹر وکیل خان، ڈی آئی جی سے ملاقات نہ ہونے کی صورت میں میں نے ایس ایس پی کو بلایا اور ان سے کہا کہ جنازے کے جلوس کو مال سے گذرنے کی اجازت یقیناً نہیں ملنی چاہیئے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مسٹر احمد رضا قصوری کو جنازہ ناصر باغ لے جانے سے روک دیں گے۔ مسٹر اصغر خان ایک چلتے پھرتے آدمی ہیں ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دونوں طرف بنائے رکھنا جانتے ہیں اس لئے میں نے انہیں کو یہ انتباہ کرنا مناسب سمجھا کہ اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہوا تو وہی اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر اصغر خان نے اس پھٹے میں پاؤں کیوں ڈالا۔"

"تو اول جب انہوں نے ہائی کورٹ میں گواہی دی ان دنوں وہ مارشل لاء حکام کے ذریعہ زیر تحقیقات تھے لہذا قدرتی طور پر انہوں نے خود کو ایک فرشتہ اور حالات کا شکار بنا کر پیش کرنا چاہا۔ انہوں نے یہ تاثر پیدا کرنا چاہا کہ ایف آئی آر میں وزیر اعظم کا نام شامل کرنے کی وجہ سے گویا انہیں ان کا غیظ وغضب کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اور احمد خاں کی لاش کو خفیہ طور پر دفن کرانے سے متعلق میری حکم عدولی کی بنا پر انہیں میری خفگی کا بھی شکار ہونا پڑا تھا۔

(جاری ہے)

‘MEYAAR PUBLICATIONS’